خوشحال جیون

پنڈت خوشدل

ویدالوم دت جی

کو

مصنف کی طرف سے بھینٹ

پنڈت گوشدل

3/3/72

خوشدل جیون

پنڈت خوشدل

قیمت فی کاپی
پانچ روپے

ملنے کا پتہ

دفتر دیش سیوک دہرہ دون

مطبوعہ محمودی پرنٹنگ پریس نزد جامع مسجد۔ دیوبند

جو دیکھا وہ لکھا

اگرچہ میری زندگی ایک عام آدمی کی مانند ہے لیکن مجھ کو کچھ ایسے عجیب و غریب حالات اور دلچسپ واقعات کا سامنا کرنا پڑا کہ جس کے باعث مجھے اپنے آپکو سمجھنے میں بہت مدد ملی چنانچہ بہت عرصہ تک ٹھوکریں کھانے اور سخت ناموافق حالات میں رہنے کے بعد میں نے رنج و غم کو ہنستے ہنستے جھیل لینا سیکھ لیا اور حق و صداقت کا اظہار بلا جھجک کرنا اپنا اصول بنا لیا۔ گذشتہ پچیس ۲۵ ۔ چھبیس ۲۶ سالوں سے میرا یہ خیال ایک پکے یقین کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ ہر انسان فقط ایمانداری نیکی۔ سچائی اور بے غرض خدمت کے راستوں پر چل کر ہی دلی سکون اور سچی شہرت حاصل کر سکتا ہے۔ میرا یہ عقیدہ بھی بہت پختہ ہو چکا ہے کہ حق پرستی اور ایمانداری پر کاربند رہنے والے اشخاص کی قدرت ضرور مدد کرتی ہے۔ قدرت کا آپ کوئی نام رکھ لیں۔ بھگوان۔ اللہ۔ گوڈ (GOD) یا واہگورو یا دیگر کوئی نام۔ لیکن میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص سچائی پر مضبوطی سے قائم رہے اور اپنے فرائض کو ایمانداری و محنت سے سرانجام دے۔ اُسے کوئی غیبی طاقت اکثر اوقات اس طرح مدد دیتی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے اس عظیم مخفی طاقت کا قائل ہو جاتا ہے۔

اگرچہ میری زندگی ایک ایسی بنجر زمین کی مانند رہی ہے جس پر دنیاوی نعمتوں کا بادل

کبھی نہیں برسا۔ لیکن میں نے سورج کی جھلسا دینے والی کرنوں ہی میں بادل کی ٹھنڈک محسوس کی۔ اور اپنے حال پر مطمئن رہا۔ آج بھی میرا جیون ایک ایسی موج کی طرح ہے جو ساحل کی تلاش میں رات دن سر پٹکتی رہتی ہے لیکن ابھی تک اُسے ساحل نہیں ملا۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی گذشتہ زندگی عام آدمیوں سے کچھ مختلف ڈھنگ سے گذاری ہے اور آج بھی میرا جیون دُنیا کی عام روش سے الگ اور نرالا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایک عام انسان کی طرح میں بھی کام۔ کرودھ۔ اور موہ و اہنکار کا شکار رہوں لیکن کام یعنی نفسانی خواہش کے علاوہ اور کسی بھی دوسری کمزوری کو میں نے اپنے اُوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ بچپن کے ماحول کی خرابی۔ والدین کی غریبی اور اونچی تعلیم کی کمی کے باعث آغازِ جوانی ہی میں اپنے اصلی مقصد سے میں بھٹک گیا اور نفس پرستی میں مصروف رہا۔ لیکن بھگوان کی یہ مجھ پر ضرور عنایت رہی کہ بہت زیادہ نفس پرست ہونے کے باوجود میں نے اپنی خودداری کو ہمیشہ برقرار رکھا۔

مجھے اپنی کمزوریوں کا بخوبی علم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دُنیاوی لحاظ سے میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکا کہ جس پر فخر کر سکوں۔ اس کے باوجود اپنی زندگی کے کچھ دلچسپ اور سبق آموز واقعات کو قلمبند کرنے کا خیال کافی مدّت سے میرے دل میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ میں نے ۱۹۴۸ء و ۱۹۴۹ء میں اپنے جیون کے کچھ حالات "دیش سیوک" میں "آپ بیتی" کے عنوان سے شائع بھی کئے۔ لیکن بعد ازاں یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا کیونکہ اخبار کے کام کی زیادتی کے باعث مجھے اپنی زندگی کے حالات تحریر کرنے کا وقت نہ مل سکا جب میری نظموں کا مجموعہ "شرارے" چھپا۔ تو وہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ ہندوستان کے کئی مشہور اردو شاعروں اور روزنامہ و ہفتہ وار اردو اخباروں نے "شرارے" کو ایک مفید

اور قابلِ قدر کتاب قرار دیا۔ چنانچہ میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے اپنے ایک دیرینہ خیال کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کا پکا ارادہ کر لیا۔

چند سال ہوئے میں نے شہنشاہی آشرم راجپور میں قریباً دو ماہ تک رہ کر اپنی زندگی کے خاص خاص دلچسپ اور نصیحت آموز واقعات کو کاغذی لباس پہنایا تھا اور اس سال پھر اُس پُر فضا اور سکون بخش ماحول میں رہ کر میں اپنے جیون کے حالات اور واقعات کو ترتیب دے رہا ہوں۔ ان واقعات کو لکھنے اور انھیں شائع کرنے سے میری مُراد نہ تو یہ ہے کہ میں کوئی بہت اعلیٰ قسم کا انسان ہوں کہ جس کے جیون کی پیروی لوگوں کو کرنی چاہیئے اور نہ ہی میرا مقصد اس کتاب کو شائع کر کے کسی کو ذلیل اور بدنام کرنا ہے۔ میں تو اپنی ایک دیرینہ خواہش کو پُورا کرنے کے لئے اپنی زندگی کے کچھ حالات اور واقعات پیش کر رہا ہوں تاکہ ان کو پڑھنے کے بعد کچھ لوگوں کو اس امر کا یقین ہو جائے کہ انسان دُنیا بھر کی پریشانیوں میں مُبتلا رہنے کے باوجود سچائی اور حق پرستی کے راستوں پر چل سکتا ہے اور ہر حال میں مطمئن و خوشدل رہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے ارادے کا پکا ہو اور اُسے بھگوان پر تھوڑا بہت بھروسہ ہو۔

میری ساری زندگی میں پورا ایک مہینہ بھی ایسا نہیں گزرا جس میں میں نے اپنے آپکو بالکل تندرست محسوس کیا ہو۔ سارے جیون میں مشکل سے دو تین ہفتے ہی ایسے آئے ہونگے جب میرے گھر میں پورے ایک ہفتے کا راشن موجود رہا ہو۔ ورنہ آج تک گھر میں ایک یا دو دن کی خوراک کا بندوبست ہی ہوتا رہا اور نہ جانے کب تک یہی سلسلہ چلتا رہے میری زندگی اُس پرندے کی مانند ہے جو صبح ہوتے ہی آب و دانہ کی تلاش میں اپنے گھونسلہ سے نکل پڑتا ہے اور جو کچھ اُسے ملجاتا ہے اُسے لیکر واپس آجاتا ہے اور اپنے بچوں کو کھلانے کے بعد اُس سے اپنا پیٹ بھر کر اطمینان سے اپنے گھونسلے میں بیٹھ جاتا ہے۔ میں بھی ہر روز تازہ کنواں کھودتا ہوں اور تازہ پانی پیتا ہوں

میرے اخبار کا ہر خرچ لگ بھگ پانچ سو روپے (-/Rs 500) ماہوار ہے۔ میرا اپنا گھریلو خرچ بھی تین ساڑھے تین سو روپے ماہوار سے کم نہیں گویا آٹھ صد روپے -/Rs 800 سے زائد میرے اخبار اور گھر کا خرچہ ہے لیکن یہ تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ آج تک میں اخبار کی ترویج و اشاعت کے لئے نہ تو اکٹھا کاغذ خرید سکا اور نہ اپنے گھر میں ایک ہفتے کا پورا راشن ڈال سکا ساری عمر قرضدار رہا اور گذشتہ دو تین سالوں سے تو قرضے کے بوجھ سے بعض اوقات میرا دم بھی گھٹنے لگتا ہے لیکن بھگوان کی رحمت اور اپنی نیک نیت کے بھروسے پر مشکل سے مشکل حالات میں بھی خوش و خرم رہتا ہوں اور اس نیم فاقہ کشی اور بے بسی کی زندگی میں بھی خدا کا شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں۔ ایسی صبر آزما زندگی کے باوجود اگر میں سچائی۔ ایمانداری۔ دیش بھگتی اور حق پرستی کے راستوں پر چلتا رہا ہوں اور آئندہ بھی چلنے کا پکا ارادہ رکھتا ہوں تو یہ بھگوان کی نظر عنایت ہے ورنہ ایک عام آدمی کے لئے ایسے ناموافق اور پریشان کن حالات میں حق و صداقت کی راہ پر زیادہ دیر تک چلنا ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے زندگی کے سفر میں مجھے کئی مطلب پرست دوست ملے اور بہت سے بے اصولے اور لالچی ساتھی۔ دو تین دوستوں نے صدق دل سے میری مدد بھی کی لیکن افسوس میں آج تک اپنے کسی رشتہ دار یا دوست کی کوئی خاص مدد نہ کر سکا۔

اس کتاب میں جن واقعات کا ذکر میں نے کیا ہے وہ سو فیصدی (%100) سچے ہیں لیکن اس خیال سے کہ میری کتاب کا کچھ لوگوں کی زندگیوں پر برا اثر نہ پڑے۔ میں نے کچھ اشخاص کے اصل ناموں کی بجائے اُن کے فرضی نام لکھ دیئے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی شخص سے جو میری بات چیت ہوئی ہو اُسکے وہی الفاظ کتاب میں درج نہ ہو سکے ہوں جو اُس موقع پر استعمال کئے گئے تھے لیکن میں نے اپنی یادداشت کے مطابق وہی الفاظ اور فقرے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ لفظی کمی بیشی کے باعث نہ تو میں نے اصلیت پر پردہ پڑنے دیا اور نہ مفہوم میں تبدیلی

آنے دی۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد میرے مخالفوں اور دشمنوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن مَیں نے آج تک اس امر کی کبھی پرواہ نہیں کی کہ حق و صداقت کے اظہار کے لئے کوئی مجھ سے ناراض ہوتا ہے یا خوش۔ ہاں کسی بات کو کہنے یا لکھنے سے پیشتر اس امر کا مَیں دھیان ضرور رکھتا ہوں کہ وہ بات میرے علم اور یقین کے مطابق صحیح اور سچ ہو۔ مَیں سچائی کو بیان کرنے میں نہ تو جھجک محسوس کرتا ہوں اور نہ ہی خوف۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ مَیں نے چند ایسے اشخاص کے بارے میں بھی سچی سچی باتیں لکھ دی ہیں جو یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ لوگ اُن کی زندگی کے کسی تاریک پہلو سے بھی واقف ہوں اسلئے ممکن ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہوں اور مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں لیکن مَیں سچائی کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔ اور اسکے اظہار کیلئے پہلے بھی کئی آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا خندہ پیشانی سے کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی ہر آفت و پریشانی کو خوش آمدید کہنے کیلئے تیار رہوں گا۔

آخر میں سنسکرت کا ایک شلوک درج کر رہا ہوں جو میرے دلی جذبات کا آئینہ ہے اور جس کو سُن کر میرے دل کو یہ تسلی ہوئی کہ مَیں نے اپنے اور دیگر لوگوں کے متعلق سچے واقعات لکھ کر کوئی قابلِ ملامت کام نہیں کیا۔

(پنڈت خوشدل)

निन्दन्तु नीति निपुणा यदि व स्तुवन्तु
लक्ष्मी : समाविशतु गच्छतु या यथेष्टम
अद्यैव व मरणमस्तु युगान्तरे वा न्यायात्पथ !
प्रविचलन्ति पदं न धीरा "

یعنی۔ نیتی پر چلنے والے ہماری نندا (بدنامی) کریں یا تعریف، ہم ہمیشہ مال و دولت اور شہرت سے بھرپور رہیں یا ہمیشہ کے لئے ان سے محروم ہو جائیں آج ہماری موت ہو جائے یا ہم دنیا کے خاتمہ تک زندہ رہیں لیکن دھیرپرُش (سنجیدہ شخص) انصاف اور سچائی کے راستے سے ادھر اُدھر نہیں ہوسکتے۔

میں کیا ہوں!

میں اپنی نظر میں بہت اعلیٰ تو نہیں ہوں
لیکن نگہِ دہر میں ادنیٰ تو نہیں ہوں

معلوم ہے ہر اک کو میری زیست کا مقصد
جو حل نہ کسی سے ہو وہ عقدہ تو نہیں ہوں

مرجھا گیا جو وقت سے پہلے وہ پھول ہوں
جو سب کو کھٹکتا ہے وہ کانٹا تو نہیں ہوں

ہر اک کی جو پیاس بجھاتا وہ ہوں چشمہ
کشتی جو کرے غرق وہ دریا تو نہیں ہوں

بے شک ہوں غریب اور بہت زار و پریشاں
سچ بات کے کہنے سے میں ڈرتا تو نہیں ہوں

چلتا ہی رہا ہوں رہِ نیکی پہ ہمیشہ
اس راہ سے لیکن کبھی بھٹکا تو نہیں ہوں

مجھ کو جو برا کہتے ہیں، کہتے رہیں لیکن
میں حلقۂ احباب میں رسوا تو نہیں ہوں

افسوس یہی آتا ہے ہر دم میرے دل کو
اچھا ہوں مگر میں بہت اچھا تو نہیں ہوں

سیوا وطن و قوم کی کرتا ہے میرا کام
گو دیش کا اپنے کوئی نیتا تو نہیں ہوں

بے گانوں یگانوں کا مجھے فرق ہے معلوم
انسان ہوں ہر چند فرشتہ تو نہیں ہوں

دنیا کی سہولت نہیں حاصل مجھے کوئی
حالت پہ مگر اپنی میں روتا تو نہیں ہوں

دو روٹیوں کے واسطے کرتا ہوں مشقت
دنیا کے زر و مال کا شیدا تو نہیں ہوں

کیوں ذاتِ خدا پر مجھے دل سے نہ یقیں ہو
دنیا کی طرح بندۂ دنیا تو نہیں ہوں

خوشتر دل مجھے دنیا نے جو سمجھا ہے تو سمجھے
لیکن غمِ دنیا سے مبرا تو نہیں ہوں

میرے پتاجی

میرے پوجیہ پتاجی کا نام پنڈت دھنپت رائے ہے اُن کے پتا یعنی میرے دادا پنڈت نتھو رام جی ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں احمد نگر میں رہتے تھے جب وہ سورگباش ہوئے تو میرے پتاجی کی عمر قریباً پانچ سال کی تھی ایک سال کے بعد میری دادی جی بھی انتقال فرما گئیں چنانچہ چھ سال کی عمر میں ہی یتیم ہو کر میرے پتاجی نے اپنے چاچاجی کے ہاں رہنا شروع کر دیا جو اُسی گاؤں میں رہتے تھے دو ڈھائی سال وہاں رہ کر چاچاجی کی گائیں اور بھینس چراتے رہے اور روکھا سوکھا کھا کر گزارا کرتے رہے۔ آٹھ سال کی عمر میں گاؤں چھوڑ کر اپنی بڑی بہن کے پاس گوجرانوالہ پہنچ گئے چند دن وہاں رہے۔ پھر ایک دن صبح سویرے وہاں سے بھی چل دیئے اور شام ہونے تک پیدل ہی لاہور پہنچ گئے۔ اُس وقت اُن کی جیب میں صرف دو پیسے تھے اُن دنوں دریائے راوی پر پختہ پل نہ تھا۔ مسافر کشتیوں کے ذریعہ آر۔ پار آتے جاتے تھے چنانچہ ایک پیسہ کشتی کا کرایہ ادا کر کے یہ بھی پار اُتر گئے لیکن کشتی سے اُترنے کے فوراً بعد تھکان اور بھوک کے باعث ریت پر گر گئے اور بیہوش ہو گئے۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں تک بیہوش پڑے رہے لیکن جب ہوش آیا تو اپنے قریب دو تین آدمیوں کو کھڑے پایا اُن میں سے ایک شخص نے جب میرے پتاجی کا حسب نسب پوچھا اور لاہور میں آنے کی وجہ دریافت کی تو اُنہوں نے بتایا میرے والدین مر چکے ہیں۔ ہماری زمین اور مکان اور دیگر سامان پر میرے چاچا نے قبضہ کر لیا ہے۔ مجھے نوکروں کی طرح گھر میں رکھا اور گائیں بھینس چرانے اور کھیتوں

کی رکھوالی کا کام مجھ سے لیتے رہے۔ مَیں نے جب اُن سے کہا کہ مجھے بھی اسکول میں داخل کروا دو تو مجھے اُنہوں نے خوب مارا۔ چنانچہ مَیں گاؤں سے بھاگ آیا۔ گوجرانوالہ میں اپنی بڑی بہن کے پاس پہنچا۔ اُس سے مدد مانگی لیکن اُس نے بھی انکار کر دیا چنانچہ بھگوان پر بھروسہ رکھ کر لاہور کا رُخ کیا۔ اور پیدل ہی یہاں پہنچ گیا اب محنت مزدوری کروں گا اور فالتو وقت میں پڑھا کروں گا۔

میرے پتاجی کی صاف گوئی اور سادگی سے ایک سجن بہت متاثر ہوئے اُنہوں نے کہا "بیٹے۔ تم میرے گھر میں رہو۔ گھر کا معمولی کام کاج کر دیا کرو جس کے لئے تمہیں دو روپے ماہوار تنخواہ ملیگی۔ مَیں دفتر سے واپس آکر ہر روز رات کو تمہیں اردو اور انگریزی پڑھا دیا کروں گا۔ پتاجی کو دل کی مُراد حاصل ہو گئی اسلئے وہ اُس سجن کے ہاں نوکری کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اور اسکے ساتھ چلدیئے۔ قریباً دو سال اُس سجن کے گھر میں رہے اور اس دوران اردو اور انگریزی تھوڑا تھوڑا لکھنا پڑھنا سیکھ گئے۔ ایکدن لاہور چھاؤنی گئے تو ایک چھاپے خانے کے مالک سے ملکر اُس سے کام سکھانے کی پرارتھنا کی۔ وہ رضامند ہو گیا اور چار روپے ماہوار تنخواہ دینی منظور کر لی چنانچہ یہ واپس لاہور آئے اور اپنے پہلے مالک اور سرپرست سے اجازت لیکر چھاپے خانے میں جا پہونچے۔ دو تین سالوں تک اُس پریس میں پتاجی نے بڑی محنت سے کام کیا جس سے پریس کا مالک اُن پر بہت مہربان اور خوش رہا اور اُس نے نہ صرف اُن کو ایک اچھا کمپوزیٹر (Compositor) بنا دیا بلکہ اُنکی تنخواہ بھی آٹھ یا دس روپے ماہوار کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد اُس پریس کے تمام کرمچاری ایکدن کسی میلے کو دیکھنے گئے۔ واپسی پر وہ سب اُس راستے سے آئے جہاں ملٹری مقیم تھی ایک بیرک (BARRACK) میں ملٹری کا پریس چل رہا تھا۔ سب پریس کرمچاری وہاں کھڑے ہو کر پریس کو

دیکھنے لگے اتنے میں ایک انگریز فوجی کپتان وہاں آگیا۔ ان کے ساتھی تو اُس ملٹری افسر
کو دیکھ کر بھاگ نکلے لیکن میرے پتا جی وہاں کھڑے رہے۔ فوجی کپتان ان سے مخاطب
ہو کر بولا۔ بوائے نوکری کرنا مانگتا۔ یہ بولے یس سر (Yes Sir) "کیا پے (Pay)
لے گا۔"؟ کپتان نے پوچھا۔ یہ بولے "جناب میں یہ کام خوب اچھی طرح جانتا ہوں
اور ایک پریس میں کمپوزیٹر کا کام کرتا ہوں۔ فوجی افسر نے پھر سوال کیا۔ وہاں کیا
تنخواہ ملتی ہے؟ میرے پتا جی نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ سر پندرہ روپے ماہوار" ٹھیک ہے
کیپٹن بولا۔ ہم تم کو بیس روپے (Rs 20/-) ماہوار دیگا۔ اگر تم اچھا کام کرے گا تو اور ترقی
کر دے گا۔ پتا جی اس پیش کش سے بہت خوش ہوئے اور اگلے دن کام پر حاضر ہونیکا وعدہ کرکے
واپس گھر آئے۔ اگرچہ پہلے پریس والا مالک انھیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اور اُس نے بھی اُن کی تنخواہ
میں اضافہ کرنے کے لئے کہہ دیا۔ لیکن میرے پتا جی نے اُس کی منت سماجت کی اور اپنے مستقبل کا واسطہ
دیا۔ تو وہ مان گیا اور اُس نے حساب کر دیا یعنی اُن کو کام سے چھٹی دیدی۔ چنانچہ یہ اگلے دن سرکاری
ملازمت میں آگئے۔ پتا جی چند سالوں تک ملٹری کے رجمنٹل پریس (REGIMENTAL PRESS)
میں کام کرتے رہے اور اُن کی تنخواہ بھی تیس روپے (Rs 30/-) ماہوار ہو چکی تھی۔ افسر ان کے
کام سے بہت خوش تھے چونکہ اپنے کام کے بعد یہ اپنی پڑھائی لکھائی بھی کیا کرتے تھے اسلئے اب انگریزی
میں بات چیت کرنا ان کو اچھی طرح آگیا تھا۔ نیز اب یہ بچپن کی حدود سے نکلکر جوانی کے عالم
میں پہنچ چکے تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے، نیز سادہ خوراک کھاتے اور باقاعدہ ورزش کرنے کے
باعث اُنکی صحت بہت اچھی تھی اور یہ اپنی عمر سے پانچ، سات سال بڑے دکھائی دیتے تھے کچھ عرصے
کے بعد اُن کی سگائی ایک جگہ طے ہو گئی۔ اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی لیکن شادی سے کچھ مہینے پہلے
ہی اُن کی پلٹن کو کابل کی طرف کوچ کرنے کا حکم مل گیا۔ میرے پتا جی ہندوستان سے باہر نہیں جانا چاہتے

تھے چنانچہ اُنہوں نے اپنے افسر سے اپنی شادی کی بابت بتا کر پلٹن کے ساتھ کابل جانے میں مجبوری کا اظہار کیا۔ افسر چونکہ اُن کے کام سے بہت خوش تھا۔ اسلیئے اُن سے بہت مہربانی سے پیش آیا کرتا تھا اُس نے نہ صرف اُن کو ملٹری کی نوکری سے چھٹی دِلادی بلکہ سرکار سے منظوری لیکر ملٹری کا پریس بھی اُن کو سستے داموں پر دیدیا۔ پتاجی چونکہ مستقل طور پر لاہور چھاؤنی میں رہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اسلئے اُنہوں نے تراس محلہ لاہور چھاؤنی میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ مکان کے ساتھ ہی ایک دوکان تھی جس میں پتاجی نے اپنا پریس لگا دیا۔ پریس کا نام اُنہوں نے نہیں بدلا بلکہ ملٹری کے پُرانے نام رجمنٹل پریس کا بورڈ لگا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ قدرت اُن پر مہربان تھی۔ بہت تھوڑے ہی عرصے میں اُن کا کام چل نکلا اور پتاجی نے اتنا روپیہ کما لیا جس سے ایک مکان اور دُوکان خرید لی جسمیں اُن کی رہائش اور پریس تھا۔

سنہ ۱۹۰۷ء یا سنہ ۱۹۰۸ء میں ایک چالاک شخص نے میرے پتاجی کو ایک ایسے چکر میں ڈال دیا کہ جسکے باعث نہ صرف اُن کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا بلکہ اُن کی دھرم پتنی بھی صدمے کے باعث سورگباش ہو گئیں۔ دو سال تک عدالتوں کی خاک چھاننے کے بعد یہ باعزت بری ہو گئے لیکن اس چکر اور پریشانی نے اُنکے دِل پر گہری چوٹ لگائی اور اُنکی زندگی کا دھارا بدل دیا پہلے تو یہ دِن رات کام کر کے روپیہ کمانے اور اُسے جمع کرنے میں لگے رہتے تھے۔ لیکن اب اُنہوں نے روپیہ کمانے کی طرف اپنی توجہ کم کر دی اور اپنا زیادہ تر وقت پوجا پاٹھ اور سوشل کاموں میں صرف کرنا شروع کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں اُن کی دوسری شادی ہوئی اور دو سال بعد یعنی ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء کو میری پیدائش لاہور چھاؤنی میں ہوئی۔ میرا نام ترلوک ناتھ رکھا گیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے کچھ پہلے جب مجھے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور مَیں نے بھجن و نظمیں لکھنی شروع کیں تو مَیں نے اپنے نام کے ساتھ اپنا تخلص خوشدل بھی جوڑ لیا۔ اُن دنوں جتنی نظمیں میری چھپیں۔ وہ سب ترلوک ناتھ خوشدل

کے نام سے شائع ہوئیں۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری بڑی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو مجھے
پنجاب چھوڑ کر سنہ ۱۹۴۰ء کے آغاز میں بندرابن جا کر کچھ عرصہ رہنا پڑا۔ بعد ازاں میں بال بچوں
سمیت رشی کیش چلا گیا۔ اور وہیں چار پانچ سال تک رہا۔ اُنہی دنوں میں نے اپنا پُرانا نام
لکھنا ترک کر دیا اور اپنے تخلص کے ساتھ لفظ پنڈت جوڑ کر اپنا نام اور تخلص پنڈت خوشدل
رکھ لیا۔ ایسا میں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کیلئے کیا تھا۔ کیونکہ اکثر اردو اخبارات
میں تین چار ایسے شاعروں کا کلام چھپتا رہتا تھا۔ جن کا تخلص خوشدل تھا۔ اب بھی سارے
بھارت ورش میں چار پانچ ایسے شاعر ہیں جو اپنے اصلی ناموں کے ساتھ اپنا تخلص خوشدل
بھی لکھتے ہیں لیکن پنڈت خوشدل کے نام اور تخلص کا کوئی دوسرا شخص ہندوستان میں نہیں
کم از کم میرے علم میں ایسا کوئی شاعر آج تک نہیں ہوا۔ جو پنڈت خوشدل کے نام سے لکھتا ہو
چنانچہ اب کسی بھی اخبار میں پنڈت خوشدل کے نام سے چھپنے والی نظم پڑھ کر ہندوستان
اور پاکستان کا ادب نواز طبقہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ کلام دہرہ دون میں رہنے والے پنڈت خوشدل
ایڈیٹر "دیش سیوک" کا ہے۔

جب میں چار پانچ سال کا تھا تو میرے پتاجی لاہور چھاؤنی میں اپنا پریس بیچ کر گوجرانوالہ
چلے گئے۔ اور وہاں ایک نیا پریس خرید کر لگایا جس کا نام اُنہوں نے "مدرا پرنٹنگ پریس"
رکھا۔ چونکہ "مدرے" ہماری ذات ہے اسلئے پتاجی نے اپنے پریس کا یہ نام رکھا دو اڑھائی
سالوں کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء کا خونی دور آیا جس میں انگریزوں نے کئی شہروں میں بے پناہ
مظالم ڈھائے میں ان دنوں گوجرانوالہ کے ایک سکول میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا
مجھے خوب یاد ہے کہ ہر روز اسکول لگنے سے پیشتر ہمیں ایک میدان میں جمع ہو کر یونین جیک
(UNION JACK) یعنی انگریزوں کے قومی جھنڈے کو حکماً سلامی دینی پڑتی تھی

ہر روز رات کو شہر بھر کرفیو لگا دیا جاتا تھا اور جو ہندوستانی بغیر ملٹری کے جاری شدہ پاس (pass) کے باہر نکلتا تھا ملٹری کے گورے اُسے گولی کا نشانہ بنا دیتے تھے۔

ہمارے مکان کے نزدیک ایک بوڑھا بھگت رہتا تھا جو صبح سویرے تین بجے نہا دھو کر پوجا پاٹھ کرنیکا عادی تھا۔ ایکدن وہ صبح اُٹھا تو نہانے کے لئے اسکے یہاں پانی نہیں تھا وہ کنوئیں پر نہانے جانے لگا۔ تو میرے پتا جی نے اُسے روکا لیکن وہ نہیں مانا۔ کہنے لگا۔ مجھ بوڑھے سے انگریزوں کی کیا دشمنی ہے۔ وہ مجھے کچھ نہ کہیں گے۔ پتا جی نے بہتیرا اُسے سمجھایا لیکن وہ بضد رہا اور اپنا بنٹا (گاگر) اٹھا کر کنوئیں پر چلا گیا۔ صبح مجھے پتا جی نے بتایا کہ جب بھگت جی پانی کی گاگر لیکر سڑک پار کرکے گلی میں داخل ہو رہے تھے تو ملٹری کے دو گورے گشت کرتے ہوئے اُدھر آنکلے۔ اور انہوں نے بھگت جی سے کچھ پوچھ تاچھ کئے بغیر گولی مار کر اُن کو ہلاک کر دیا۔ پتا جی کی زبانی یہ واقعہ سُنکر میرے ننھے سے دل پر گہری چوٹ لگی۔ اور پہلی بار میرے دلمیں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ بعد ازاں انگریزوں کے مظالم اور خاص طور پر جلیاں والہ باغ میں ہندوستانیوں پر بے تحاشا فائرنگ کی داستانیں سُن سُن کر میرے دل پر یہ بات نقش ہوتی گئی کہ انگریز قوم ایک ظالم اور جابر قوم ہے اور ہندوستانیوں کی جانی دشمن ہے۔

بچپن سے جو نقوش میرے دل پر ہوئے وہ جوان ہونے پر اور بھی گہرے ہوتے گئے۔ چنانچہ ریلوے اور ملٹری ڈیری فارم میں ایک ایک سال ملازمت کرنے کے بعد سنہ ۱۹۳۰ء میں مَیں نے یہ پرتگیا کر لی کہ آئندہ ساری عمر سرکاری ملازمت نہ کروں گا اور اپنے تمام سرٹیفکیٹس (CERTIFICATES) جلا دیئے۔ مَیں نے اُس وقت یہ بھی پرتگیا کی کہ کبھی انگریزوں کے ساتھ تعاون نہ کروں گا۔ بلکہ انگریزی حکومت کا خاتمہ

کرنے کے لئے اپنے ڈھنگ سے کام کرتا رہوں گا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میں انگریزی حکومت کے خلاف ہر حربے کے استعمال کو جائز سمجھتا تھا۔ اور میں کبھی بھی مہاتما گاندھی کے "عدم تشدد" کا قائل نہیں ہوا۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں میرے پتا جی گوجرانوالہ سے پھر لاہور چھاؤنی واپس آ گئے اور اپنی بچی کھچی جائیداد کو فروخت کر کے ایک جگہ محلہ اس محلہ میں خریدی اور وہاں لڑکیوں کا ایک اسکول کھول دیا جس کا نام انہوں نے "براہمن سبھا پتری پاٹھ شالا" رکھا۔ اسی وقت انہوں نے لاہور چھاؤنی میں اپنے دو تین دوستوں (ڈاکٹر ہندرا بن ہیجی آف اکال گڑھ اور پنڈت رام کشن وغیرہ کے ساتھ) مل کر براہمن سبھا بھی قائم کر دی۔ جسکے جنرل سکریٹری وہ خود بنے۔ چونکہ اپنا مکان بیچکر اور اس سے حاصل شدہ روپیہ سے انہوں نے براہمن سبھا پتری پاٹھ شالا کی بلڈنگ خرید لی تھی اسلئے خود اپنے بال بچوں سمیت بزاز محلہ میں ایک مکان کرایہ پر لیکر رہنے لگے۔ اور آخری دم تک اُسی محلہ میں رہے اور یہیں میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ بہت جلد براہمن سبھا اور پتری پاٹھ شالہ ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی گئی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آگیا۔ جب براہمن سبھا لاہور چھاؤنی کے سالانہ جلسے ایک امتیازی شان کے مالک ہوتے تھے۔ اور براہمن سبھا پتری پاٹھ شالہ کے رتن۔ بھوشن اور پربھاکر کے امتحانات کے نتائج ضلع لاہور کے تمام لڑکیوں کے اسکولوں سے اچھے ہوتے تھے چونکہ میرے پتا جی لڑکیوں کو انگریزی تعلیم دینے کے سخت خلاف تھے اسلئے اُن کے اسکول کو انگریزی سرکار سے نہ کوئی مدد ملی۔ اور نہ ہی کبھی سالانہ گرانٹ وغیرہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آریہ سماج۔ شری گورو سنگھ سبھا اور لاہور کی سناتن دھرم سبھا

نیز دیگر دھارمک سنستھاؤں کی طرف سے لڑکیوں کے جاری کردہ تمام اسکولوں میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن ضلع لاہور میں براہمن سبھا پتری پاٹھ شالہ لاہور چھاؤنی ہی ایک ایسا تعلیمی ادارہ تھا جہاں لڑکیوں کو صرف ہندی پڑھائی جاتی تھی۔ اور انگریزی پڑھانے پر سخت پابندی تھی۔ ہاں۔ پتاجی اپنے سکول میں لڑکیوں کو ہندی کی کتابی تعلیم دینے کے علاوہ انکو سلائی۔ کٹائی۔ اور کھانے پکانے کی عملی تعلیم بھی دِلوایا کرتے تھے۔

میرے پتاجی جب ۱۹۴۴ء میں بیمار ہوئے تو اُنہوں نے براہمن سبھا پتری پاٹھ شالہ کا ایک ٹرسٹ بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن موت نے اُن کو اس امر کی مہلت نہ دی کہ وہ ٹرسٹ کو رجسٹرڈ کروالیں۔ اور وہ یہ خواہش اپنے دِل ہی میں لئے سورگباش ہو گئے۔

۴ اپریل ۱۹۴۵ء کو میرے پتاجی سورگ سدھارے۔ اُس وقت براہمن سبھا پُتری پاٹھ شالہ کی بلڈنگ کی مالیت کا اندازہ قریباً ایک لاکھ روپے کا تھا۔ اگرچہ اس بلڈنگ کے کاغذات رجسٹری وغیرہ میری ماتاجی کے پاس تھے اور دہرہ دُون میں آکر میری ماتاجی نے اس بلڈنگ کا کلیم داخل بھی کرنا چاہا لیکن میری سخت مخالفت کے باعث وہ ایسا نہ کر سکیں۔ یہی نہیں بلکہ جو مکان میرے پتاجی نے اپنے آبائی گاؤں احمد نگر ضلع گوجرانوالہ میں بنوایا تھا میں نے اُس کا کلیم بھی ماتاجی کو داخل نہ کرنے دیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ احمد نگر گاؤں کے تین چار اشخاص دہرہ دُون میں بھی رہتے ہیں اور ایک سجن (گوجرانوالہ جیولرز کے مالک) کا مکان تو ہمارے مکان کے بالکل قریب تھا۔ اُنہوں نے بہتیرا میری ماتاجی کو اور مجھے بھی کہا کہ اس مکان کا کلیم ضرور داخل کرنا چاہیئے اور اس سلسلے میں وہ شہادت بھی دینے پر تیار ہے لیکن میں نہیں مانا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ ہم رفیوجی جب اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے

بھارت کی آزادی کے لئے اپنے گھر بار کو چھوڑا ہے تو پھر اس کا معاوضہ لینا کسی صورت بھی درست نہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے نہ تو سرکار سے کوئی جائیداد اپنے نام الاٹ کروائی اور نہ ہی دیگر کوئی سہولیت یعنی کوٹہ یا پرمٹ وغیرہ لیا۔

میرے پتا جی کا دیہانت ستر (۷۰) سال کی عمر میں ہوا اُنکی ساری زندگی جدّوجہد میں گزری۔ اپنی محنت اور ہمّت سے اُنہوں نے کافی دولت کمائی اور اچھی شہرت بھی پائی۔ چونکہ وہ ٹھوس کام کرنے کے حامی تھے اسلئے پبلسٹی سے دور بھاگتے تھے۔ ساری عمر سادگی سے رہے۔ شراب گوشت کے نزدیک تک نہ گئے۔ جوانی میں چند سال تک حقّہ ضرور پیا۔ لیکن جب براہمن سبھا پتری پاٹھ شالہ بنائی تو حقہ پینا بالکل ترک کر دیا جب سے پتا جی نے ہوش سنبھالا اُس وقت سے لیکر آخری بار بیمار ہونے تک صبح کی سیر کے سخت پابند رہے۔ ہر روز صبح سویرے چار بجے گھر سے سیر کیلئے باہر نکل جاتے اور چار پانچ میل کی سیر کرکے گھر واپس آتے۔ کٹّر دھارمک ٹائپ کے انسان تھے۔ سچ بولنے اور سادہ جیون بسر کرنے کی عادتیں مجھے اپنے پتا جی سے ورثہ میں ملیں۔ افسوس ہے کہ میں صبح کی سیر کی عادت نہ ڈال سکا جس کا خمیازہ اب مختلف بیماریوں کی شکل میں بُھگت رہا ہوں۔

میرے پتا جی کی سوشل اور دھارمک حلقوں میں مقبولیت کا اندازہ براہمن سبھا پتری پاٹھ شالہ لاہور چھاؤنی کی میجنگ کمیٹی کے اُس پرستاؤ سے لگایا جا سکتا ہے جو اُن کی موت کے بعد ایک خاص میٹنگ میں مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۴۵ء کو پاس کیا گیا۔ اور جس کی ایک نقل مجھے بھی بھیجی گئی تھی۔ براہمن جاتی کے ایک دیگر سچے سیوک اور "براہمن گزٹ" کے سنچالک پنڈت دلستہ پرشاد فدا میرے پتا جی کے گہرے دوستوں میں سے ایک تھے۔ اُنہوں نے میرے پتا جی کی موت پر ایک دردناک نوٹ براہمن گزٹ میں لکھا تھا لیکن افسوس وہ پرچہ مجھ سے

کہیں گم ہو گیا۔ ہاں لاہور سے شائع ہونیوالے ایک دوسرے ماہنامے "برہم سندیش" کے جس پرچے میں میرے پتا جی کی موت کے متعلق خبر شائع ہوئی تھی اُس کا کٹنگ اب تک میرے پاس محفوظ ہے اُس کا اقتباس اور تیری پاٹھ شالہ کی پربندھک کمیٹی کا پرستاو یہاں درج کرتا ہوں۔

نقل پرستاو براہمن سبھا لاہور چھاؤنی مورخہ ١٩٤٥-٤-١١

"پنڈت دھنپت رائے کی مرتیو پر پربندھک کمیٹی اتینت شوک پرگٹ کرتی ہے پنڈت جی پاٹھ شالہ کے بانی تھے اور ان کی کوشش ہی سے یہ پاٹھ شالہ کئی سخت مشکلات کے باوجود عرصہ پچیس ٢٥ سال تک جنتا کی سیوا کرتی رہی ہے پنڈت جی نڈر اور بے باک شخص تھے۔ پنڈت جی کا پاٹھ شالہ کے ساتھ اتنا گہرا سمبندھ تھا کہ اکثر بیہوشی کی حالت میں بھی وہ پاٹھ شالہ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اُن کا جیون پاٹھ شالہ پر نثار تھا کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ اُن کی مرتیو سے پیدا شدہ خلیج کو پُر کرنا بہت مشکل کام ہے تاہم کمیٹی اُن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریگی۔ اور اُن کے پیار سے سینچے ہوئے پودے کو پرپھلت رکھنے میں ہمیشہ کوشاں رہے گی۔ پنڈت جی ہمارے درمیان اب نہیں رہے لیکن اُن کی رُوح ہمیشہ ہماری رہبری کرتی رہے گی۔ کمیٹی پنڈت جی کے وارثان اور رشتے داروں سے اُن کے شوک میں شامل ہوتے ہوئے دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور پرمیشور سے پنڈت جی کی رُوح کو شانتی بخشنے کی پرارتھنا میں شامل ہے۔"

دستخط۔ کرپا رام بھاردواج۔ سکریٹری

"براہمن جاتی کا ایک پُرانا سیوک چل بسا"

"افسوس ہے کہ پنڈت وصنپت رائے جی مدہ اساکن لاہور چھاؤنی ۴ راپریل ۱۹۴۵ء کو سورگباش ہو گئے۔ آپ براہمن جاتی کے پُرانے خادم تھے آپ نے اپنے دیگر متروں ڈاکٹر بندرابن اور پنڈت رام کشن کے ساتھ ملکر براہمن سبھا لاہور چھاؤنی کی بُنیاد رکھی تھی۔ اسکے علاوہ آپنے براہمن سبھا پُتری پاٹھ شالہ بھی اپنے دھن سے کھولی تھی جس میں نہ صرف۔ رتن۔ بھوشن اور پربھاکر کی شکشا لڑکیوں کو دی جاتی تھی بلکہ اُسکے نتائج آریہ سماج سنگھ سبھا اور سناتن دھرم پتری پاٹھ شالاؤں سے بڑھکر نکلتے رہے۔ یہ واقعی تعجب کا مقام ہے اور خوشی کی بات ہے کہ لاہور جیسے بڑے شہر میں تو براہمن جاتی کی کوئی سنستھا نہ ہو لیکن لاہور چھاؤنی میں براہمن پتری پاٹھ شالہ اعلیٰ پیمانے پر جاری رہے یہ سب پنڈت وصنپت رائے جی کی قربانی اور محنت کا نتیجہ ہے آپ ایک عرصہ سے اس کا ٹرسٹ بنانے کی فکر میں تھے مگر شاید آپ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ جو لگن براہمن جاتی کے لئے آپکے دِل میں تھی۔ کاش کہ لاہور میں بھی دو چار ایسی ہستیاں نکل آئیں تو لاہور میں بھی کوئی براہمن سنستھا بن جائے۔ آپکے سورگباش ہونے سے براہمن جاتی کو واقعی سخت دھکا لگا ہے جسکی پورتی کسی پرکار بھی نہ ہو سکے گی نہ معلوم پتری پاٹھ شالہ کا پربندھ آئندہ کیا ہو گا۔ مجھے آپکے سُپتر پنڈت بشن دل اور دیگر رشتے داروں سے دِلی ہمدردی ہے۔"

ودیا رتن پراشر ایڈیٹر۔ برہم سندیش۔ لاہور

سدھی

اور

منتر شکتی

سِدھی اور منتر شکتی

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ فلاں شخص کے پاس کوئی سِدھی ہے اور وہ عجیب و غریب روحانی طاقتوں کا مالک ہے۔ سِدھی کے متعلق مَیں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے خیال کے مُطابق کوئی شخص ایک خاص شکل کا دھیان کر کے اور اُس پر اپنی تمام دماغی قوتوں کو مرکوز کر کے جو روحانی طاقت حاصل کر لیتا ہے اُسے سِدھی کہتے ہیں۔

ممکن ہے کہ جو لوگ دیوی دیوتاؤں یا جنات کی سِدھی حاصل کر لیں وہ دُنیاوی عیش و آرام کے علاوہ خوب شہرت حاصل کر لیتے ہوں لیکن اس سلسلہ میں جن لوگوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا اُن سے سوائے مایوسی کے اور مجھے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

ایک وقت مجھ پر بھی ایسا گزرا جب میرے دماغ پر کوئی سِدھی حاصل کرنے کا جنون سوار تھا۔ چنانچہ اپنی اُس خواہش کو حاصل کرنے کے لئے مَیں کئی جگہوں پر مارا مارا پھرا چند جیوتشیوں اور سادھوؤں کے چکر میں بھی پھنسا لیکن کافی وقت اور روپیہ برباد کرنے کے باوجود کچھ پلّے نہ پڑا۔ ہاں اس امر کا ضرور قائل ہو چکا ہوں کہ سِدھی اور منتر شکتی میں ضرور کوئی صداقت ہے اگر ایک نیک دِل شخص اپنی منتر شکتی سے میرے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا ٹھیک نہ کر دیتا تو یقیناً مَیں اپنے دائیں بازو سے محروم ہو جاتا کیونکہ دو تین قابل ڈاکٹروں نے مجھے اپنا دایاں ہاتھ کٹوا دینے کا مشورہ دیا تھا یہ سارا واقعہ مَیں نے اِسباب میں درج

کر دیا ہے۔ اسکے علاوہ دو دیگر واقعات بھی یہاں لکھے ہیں۔ پہلا واقعہ تو ایک جیوتشی کے کہنے سے سدھی حاصل کرنے کی صدق دلانہ کوشش کے متعلق ہے جس پر میں نے کافی وقت اور روپیہ ضائع کیا۔ لیکن بعد ازاں پتہ چلا ہے کہ وہ جیوتشی درجہ اول کا جھوٹا۔ پاکھنڈی اور دھوکے باز ہے۔ دوسرا واقعہ جموں کے ایک ایسے شخص کے متعلق ہے جس کو میں ڈیرہ دون بھی لایا۔ اور یہاں کے ایک درجن سے زیادہ اشخاص نے اُس سدھ پرش کی عجیب و غریب روحانی طاقتوں کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن مزیدار بات یہ ہے کہ اُس سدھی یا روحانی شکتی سے نہ تو وہ خود کوئی فائدہ اُٹھا رہا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کو کوئی خاص لابھ پہنچا رہا ہے۔ کم از کم مجھے اور میرے مہربان ماسٹر کیشو چند مرحوم سابق مینجر دربار گوردوارام رائے اور سابق چیرمین سٹی بورڈ ڈیرہ دون کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ تینوں واقعات چونکہ دلچسپ ہیں اسلئے قارئین ان کو پڑھکر ضرور خوش ہوں گے۔

یکشنی دیوی کی سدّھی

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ لاہور چھاؤنی میں ایک جیوتشی کا عام چرچا تھا۔ جیوتشی صاحب ایم۔ ای۔ ایس (M. E. S.) میں کلرک تھے لیکن صبح و شام لوگوں کی مُفت سیوا کیا کرتے تھے اُن کا نام سوبھراج معدان تھا۔

لاہور چھاؤنی سے اُنکی شہرت نکل کر لاہور اور اسکے گرد و نواح میں پھیلتی گئی لوگ جوق در جوق اُن کے پاس آنے لگے۔ یہ حضرت کسی پر منگل کا سایہ بتاتے تھے تو کسی پر سنیچر کا چنانچہ سادہ لوح آدمیوں کے بُرے ستارے دُور کرنے کے لئے جپ اور پاٹھ کیلئے اُن کو رضامند کر لیتے تھے اس مقصد کے

لئے انہوں نے دو تین برا ہمن خاص طور پر رکھے ہوئے تھے چونکہ وہ سب لوگوں کو مُفت جیوتش بتانے اور بیماروں کو دوا بھی مُفت دیتے تھے اسلئے کافی تعداد میں لوگ اُن کے پاس جانے لگے۔

مَیں بھی اپنے دوست شیام لال جی کے ساتھ ایکدن اُن کی بیٹھک پر پہنچا وہاں رش کافی تھا۔ اسلئے ایک طرف بیٹھکر تماشہ دیکھنے لگا دو چار آسامیوں کو بُھگتانے کے بعد اُنکی نگاہِ کرم مجھ پر پڑی کہنے لگے آپ آگے آجائیں مَیں نے حکم کی تعمیل کی اور اُن کے قریب جا بیٹھا نام اور پیدائش کا وقت پوچھنے کے بعد اُنہوں نے ایک کاغذ پر برتھ کنڈلی بنائی اور پھر میرے بچپن سے متعلق دو تین ایسی باتیں کہیں جنکی مَیں نہ تائید کر سکتا تھا نہ تردید چنانچہ مَیں نے کہدیا کہ مجھے ان واقعات کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں۔ آپ میرے موجودہ یا آئندہ حالات بتائیں۔ وہ کہنے لگے۔

"آپکی زندگی ایک عجیب زندگی ہے آپکو دُنیا میں بہت کام کرنے ہیں اور آپ بہت بڑے آدمی بنینگے۔ اسلئے آپ کسی فرصت کے وقت تشریف لائیں مَیں آپکے مُستقبل کے تمام حالات بتا دوں گا۔"

مَیں جیوتشی کی زبانی اپنے مُستقبل کو شاندار اور نہایت خوشگوار سُنکر بہت خوش ہوا اور اگلے دن شام کو آنے کا وعدہ کرکے اُن سے رخصت ہوا۔

چنانچہ دوسرے دن شام کے وقت اپنے دوست کے ہمراہ پھر وہاں پہنچا۔ اُس وقت وہ اکیلے تھے بڑے تپاک سے ملے کہنے لگے۔

"خوشدل صاحب مَیں نے رات کو آپ کی بابت اپنے "اِشٹ دیو" سے پوچھا ہے"

کون ہیں آپکے اشٹ دیو ؟

"یکشنی دیوی"

کیا کہا اُس نے"

"یہی۔ کہ آپ اپنے دِلی ارادوں میں ضرور کامیاب ہوں گے"۔

"لیکن آپ کو میرے دلی ارادوں کا پتہ کیسے چل گیا ہے ؟"

"میں پرشن کنڈلی کی مدد سے سب کچھ جان لیتا ہوں۔ آپ دیش سیوا کا کام کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کی بھلائی کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام بنانا چاہتے ہیں۔"

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سوبھ راج جیوتش کا علم خوب جانتا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بلا کہے میرے دلی ارادوں کو جان لے۔ دراصل اُن دنوں میں اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہتا تھا کہ انگریزوں کو بھارت سے نکالنے کے لئے ایک مضبوط سنگٹھن بنایا جائے اور اس سوسائٹی میں کچھ ایسے اشخاص بھی شامل ہوں جو غیر معمولی روحانی طاقتوں کے مالک ہوں۔ میں نے شیواجی مرہٹہ کی بابت ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ وہ چنڈی دیوی کے اُپاسک تھے اور اسی باعث سے اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ چنانچہ مجھے بھی اُن دنوں یہ یہ خیال ستا رہا تھا کہ کوئی ایسا شخص ملے جو مجھے بھی کوئی دیوی شکتی حاصل کرنے کا طریقہ بتائے

میں نے جیوتشی جی سے پوچھا۔

"مجھے کس طرح اپنے ارادوں میں کامیابی مل سکتی ہے ؟"

"یکشنی دیوی کو سدھ کرنے سے"

"کیا یہ دیوی آپ کی سدھ کی ہوئی ہے ؟"

جی ہاں! پھر ایک لمحہ کے بعد جیوتشی جی کہنے لگے۔ "چونکہ آپ بنا ثبوت لئے یہ بات نہ مانیں گے اسلئے میں اپنی سدھی کا ثبوت بھی آپکو دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنا لیٹر پیڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ اس پر اپنے سوالات لکھیں اور پھر اس صفحہ کو پھاڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیں میں اپنی سدھی کے ذریعہ آپکے سوالات اور اُن کے جواب بتاؤں گا

چنانچہ مَیں نے ایک صفحہ پر اپنے سوالات لکھے اور پھر اُس صفحہ کو پھاڑ کر اپنی پاکٹ کی اندرونی جیب میں حفاظت سے رکھ لیا۔

جیوتشی جی بولے۔

"آپ آپ چند منٹ کے لئے باہر تشریف لے جائیں۔ کیونکہ مَیں یکیشنی دیوی کا آواہن کرونگا۔"

"بہت اچھا" کہہ کر ہم دونوں باہر چلے آئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا مَیں نے یہ جاننے کے لئے کہ وہ دیوی کا آواہن کس طرح کرتا ہے۔ دروازے کے ایک سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا جیوتشی صاحب کی میری طرف پیٹھ تھی وہ چوکڑی مارے بیٹھے تھے۔ دھوپ جل رہی تھی چونکہ اُن کا مُنہ دوسری طرف تھا۔ اسلئے مَیں یہ نہ جان سکا کہ وہ کچھ منتر وغیرہ بھی پڑھ رہے ہیں یا نہیں۔ اسکے بعد ہم دروازے سے الگ ہو کر دونوں دوست جیوتشی صاحب کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔

پانچ سات منٹ کے بعد اُنہوں نے دروازہ کھول دیا اور ہمیں اندر بُلا لیا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اُنہوں نے میرے ہاتھ پر ایک کاغذ رکھ دیا۔ مَیں نے پڑھا تو ہو بہو میرے سوالات کی نقل تھی۔

"اب آپ اپنی جیب سے اپنا کاغذ نکال لیں۔ اور اس سے ملائیں۔"

مَیں نے ایسا ہی کیا واقعیٔ ایک لفظ کا بھی فرق نہ تھا۔ مَیں بے ساختہ کہہ اُٹھا۔

"کمال کر دیا آپنے واقعیٔ آپ بڑے کام کے آدمی ہیں۔"

ابھی آپنے ابھی کیا دیکھا ہے سدھی حاصل کر کے آدمی بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ مَیں تو ابھی کچھ مجبور ہوں۔ وقت آنے پر دکھا دوں گا کہ مَیں آپکی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔"

"دھنیہ باد" بھگوان کرے کہ ہم اپنے دیش کی کچھ سیوا کر سکیں۔"

"آپ سب سے پہلے سدھی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

"بہت بہتر مَیں حاضر ہوں۔ بتائیے کس طرح کام کرنا ہو گا۔"

"آپ کل صبح نہا دھوکر اکیلے میرے پاس آجائیں۔ میں آپکو یکشنی دیوی کا منتر یاد کرادونگا"

"کتنے دن میں سدھی ہو جائیگی؟"۔

"اکیس ۲۱ دن میں"

"اس سے فائدہ کیا پہونچے گا؟"

آپ دوسروں کے دلوں کا حال جان لیں گے اور سب لوگوں پر اپنا اثر ڈال سکینگے
خدانخواستہ اگر برطانوی سرکار نے آپکو قید کرلیا تو آپ سدھی کی مدد سے رہائی حاصل کرسکینگے"۔

"لیکن اس کا ثبوت؟"

ثبوت میں تیار کرسکتا ہوں۔ یہ سدھی میری حاصل کی ہوئی ہے آپ مجھے کس کر ایک کرسی
پر باندھ دیں اور خود دروازہ بند کرکے ایک منٹ کے لئے باہر چلے جائیں پھر دیکھئے میں کیسے باہر آجاتا ہوں"۔

میں اور میرے دوست شیام لال نے ایک رسہ لیکر سوبھ راج کو ایک آرام کرسی پر خوب
کس کر باندھ دیا۔ اور خود دروازہ بند کرکے باہر چلے گئے۔ دو منٹ بعد ہی جیوتیشی صاحب ہنستے ہوئے
باہر نکل آئے ہم دونوں یہ ماجرا دیکھ کر حیران رہ گئے اور ہمیں یقین آگیا کہ واقعی انہوں نے سدھی
حاصل کررکھی ہے اس نے ہماری حیرانی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

میں سونا بنانا بھی جانتا ہوں۔ اگر آپ کو دیش کے کاموں کے لئے دھن کی ضرورت ہوئی
تو میں یہ گُر بھی آپکو سکھادوں گا۔ "کیا آپ سچ کہتے ہیں" میں نے پوچھا۔

"ہاں بالکل سچ میں نے رسائن کا کام ایک بنگالی مہاتما سے سیکھا ہے اپنے گرو سے میں نے
یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اس "آرٹ" سے ذاتی کوئی فائدہ نہیں اٹھاؤں گا"۔

"دھنیہ باد! معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے اپنے ارادوں میں ضرور کامیابی ملے گی اور
میں بھی اپنے دیش واسیوں کی کچھ سیوا کرسکوں گا"۔

" آپ دُنیا میں بہت کام کریں گے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دُنیا آپکے کاموں کی تعریف کریگی ایسے آپکے گرہ ہیں۔"

جیوتشی جی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔

" جو بھگوان کی اِچھا۔ کیونکہ مَیں تو دل کی گہرائیوں سے یہ مانتا ہوں کہ بنا اُس کی (ایشور) کی سہایتا کے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں خواہش میری ضرور یہ ہے کہ میرا سارا جیون اپنی جاتی اور دیش کی خدمت میں بسر ہو۔"

مَیں نے گہری سانس لیتے ہوئے سب کچھ یہ کہا۔

" آپ اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہونگے۔ لیکن سِدھی حاصل کرنا ضروری ہے اسلئے آپ پرسوں صبح چار بجے نہا دھو کر میرے پاس آجائیں مَیں آپکو منتر سکھا دوں گا اور اسکے سِدھ کرنیکا طریقہ بھی بتا دوں گا۔"

" بہت اچھا" مَیں نے احسان مندانہ لہجے میں کہا اور اپنے دوست کے ساتھ اُٹھکر چلا آیا۔

اگلے دِن لاہور میں کسی کام کی وجہ سے گیا تو پوجیہ بھائی پرمانند جی سے بھی ملا۔ مَیں اکثر اُن سے ملتا رہتا تھا۔ چونکہ اُن کی قابلیت، تیاگ، چال چلن کی پختگی اور سادگی کا مَیں بہت [illegible]ے بھگا۔ باتوں باتوں میں مَیں نے سوبھ راج جیوتشی کا ذکر کیا کہ مَیں بھی اب اسکی ہدایت کے مطابق سِدھی حاصل کرنیکا پروگرام بنا چکا ہوں اور کل سے اُس پر عمل کرنا بھی شروع کر دونگا

بھائی جی میری باتیں سُنکر کچھ مسکرائے پھر گمبھیر آواز میں بولے

" خوشدل! مجھے تو آج تک کوئی سِدھ ملا نہیں اور نہ ہی مَیں سِدھی وغیرہ کو مانتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم اس طرف قطعاً توجہ نہ دو اور نہ ہی ایسی باتوں پر روپیہ اور [illegible]

"مگر بھائی جی! مَیں تو اپنی آنکھوں سے اسکی روحانی طاقت دیکھ چکا ہوں اسی لئے اُس شکتی کو حاصل کرنیکا ارادہ کیسے چھوڑ دوں۔"

"خیر تمہاری جو مرضی ہو کرو۔ لیکن مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں۔"

"مَیں ایک ماہ کے اندر اندر آپکو یقین کرا دوں گا۔" مَیں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ بھائی جی چُپ ہو گئے۔ اور کچھ دیر بعد مَیں نمستے کر کے چلا آیا۔

اگلے دن صبح کے چار بجے نہا دھو کر جیوتشی جی کی خدمت میں پہنچا۔ کیونکہ اُنہوں نے مجھے اکیلا ہی آنے کی ہدایت کی تھی۔ اسلئے اپنے دوست شیام لال جی کو ساتھ نہ لے گیا۔ جیوتشی جی نے مجھے منتر لکھ دیا۔ اور دو تین بار اپنے سامنے پڑھوایا بھی۔ وہ منتر یہ تھا۔

"ادم بکشیہ راج تمست تو بھسیم۔ شنکر پر یہ باندھوا۔ ایکانتے ولیشیا تگا۔ نیتم یکشنی کروتے ممنہ۔"

سدھ کرنیکا طریقہ اُنہوں نے یہ بتایا کہ اس منتر کی ۱۰۱ مالائیں ہر روز پھیری جاویں مالائیں ۹۰۱ منکے ہوتے ہیں یعنی ۱۰۹ دفعہ پڑھنے پر ایک مالا پوری ہوتی ہے۔ ایسی ۱۰۱ مالائیں مجھے روزانہ پوری کرنی تھیں۔

(۲) جپ کے دوران میں ہمیشہ شُدھ وستر دھارن کئے رہنا چاہیئے۔

(۳) روٹی کنواری کنیا کے ہاتھ کی بنی ہوئی کھانی چاہیئے۔

(۴) گھر سے باہر بالکل نہ نکلنا چاہیئے۔

(۵) جھوٹ بولنا غصہ کرنا۔ انڈے اور پیاز کھانا سخت منع تھا۔ اسکے علاوہ ایک دو اور بندشیں اُنہوں نے بتائیں جن کو مَیں نے بخوبی تسلیم کیا اور اُن پر کاربند رہنے کا پکا نشچیہ کیا۔

چنانچہ وہاں سے فارغ ہوتے ہی مَیں گھر آیا۔ ایک کمرے کا تمام سامان نکالکر اُسے خوب دھویا۔ دھوپ بتی جلائی۔ اور اپنی چھوٹی بہن (جو اس وقت کنواری تھی) کو روٹی بنانے کی تاکید کر کے۔ نیز اپنے کام کاج کی بابت اپنے ایک ساتھی کو مُناسب ہدایتیں دیکر مَیں نے "سدھی" کا کام شروع کر دیا۔

میرے ماتا پتا اور دیگر رشتہ داروں اور واقف کاروں نے میرا خوب مذاق اُڑایا۔ لیکن مَیں نے پرواہ نہ کی اور موسم گرما میں بھی رات دن اُسی کمرے میں بند رہا۔ مَیں رات کو ۹ بجے منتر جپنا شروع کرتا اور صبح چار پانچ بجے تک اُسی میں مشغول رہتا اور۔ مجھے جپ شروع کئے پانچ چھ دن ہی ہوئے تھے (دھیان رہے کہ مجھے متواتر اکیس ۲۱ دن اس منتر کا جپ کرنا تھا) کہ جیوتشی جی کی دھرم پتنی ہمارے گھر آئیں۔ میری ماتا جی سے کہنے لگیں کہ اپنے لڑکے سے کہو کہ یہ جپ بند کر دے ورنہ ہم لوگوں پر بہت آفت آجائیگی۔ میری ماتا جی کچھ گھبرا سی گئیں۔ وہ پوچھنے لگیں۔

کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ تمہارے پتی نے ہی تو اسے منتر سکھایا ہے اور اِن ہی کے مشورے سے یہ سدھی کرنے بیٹھا ہے۔ وہ بولیں :۔

"کیا کہوں بہن! آج میں نلکے پر پانی بھر رہی تھی کہ ایک خوبصورت عورت سُرخ کپڑے پہنے آئی اور آتے ہی میرے مُنھ پر ایک زور کا تمانچہ مارا۔ کہنے لگی کہ خوشدل سے جپ بند کروا دو ورنہ تمہاری خیر نہیں! تمہاری زندگی کے ساتھ ساتھ مَیں خوشدل کی بیوی کی زندگی بھی ختم کر دوں گی۔ بہن میرا کلیجہ تو اُسی وقت سے دھک دھک کر رہا ہے۔ بابو جی (جیوتشی جی) دفتر گئے ہیں اور مجھے اپنے گھر میں ڈر لگ رہا ہے۔"

اس کی یہ رام کہانی سُنکر میری ماتا جی گھبرائیں چونکہ میرے کمرے کے باہر ہی یہ گفتگو

ہو رہی تھی۔ اسلئے میں نے ایک ایک لفظ سُن لیا۔ ایک لمحہ کیلئے میرے دل میں بھی کپکپی سی محسوس ہوئی۔ اپنی دھرم پتنی کی موت اور وہ بھی میری وجہ سے۔ یہ سوچکر مجھے کچھ صدمہ ہوا لیکن میرے ارادے میں کوئی کمزوری نہ آئی۔ دل نے کہا کہ اب جس کام میں ہاتھ ڈالا ہے اُسے پورا کرکے ہی اُٹھنا چاہیئے۔ چاہے بیوی مرے یا زندہ رہے۔ دماغ نے سوچا کہ سِدھی تو دیش سیوا کے لئے کر رہا ہوں اگر استری کی بلی دیکر کوئی ایسی شکتی حاصل کر لیتے ہو جس سے اپنے دیش کا بہت بڑا کام کر سکو تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ غرضیکہ ماتا جی اور جیوتشی جی کی دھرم پتنی جب تک میرے کمرے میں داخل ہوئیں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اس جاپ کو ادھورا نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ ماتا جی نے لاکھ کہا جیوتشی جی کی استری نے بہتیرا سمجھایا۔ لیکن میں نے ایک نہ سُنی۔ یہ بھی شکر ہوا کہ اس وقت میری دھرم پتنی وہاں موجود نہ تھی ورنہ وہ بھی جاپ کو چھوڑ دینے کی التجا کرتی۔ جیوتشی کی دھرم پتنی لوٹ گئی اور میں اسکی باتوں پر غور کرنے لگا۔ بہت سوچنے پر بھی میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُس نے جھوٹ کہا یا سچ۔ خیر دِن گذرتے گئے۔ اور میں اپنے کام میں لگا رہا۔ اکیس دِن پورے ہو گئے۔ آخری دِن میں جپ کے بعد بھی نہ سویا کہ شاید دیوی آئے اور مجھے سویا ہوا دیکھ کر لوٹ جائے لیکن افسوس کہ اتنی محنت کرنے پر بھی یکشنی دیوی کے درشن نہ ہوئے۔ جاپ سے فارغ ہوتے ہی میں جیوتشی جی کے پاس پہنچا پیشتر اسکے کہ میں کچھ کہتا وہ کہنے لگے۔

"جانتے ہو آپکی ناکامی کی وجہ کیا ہے؟"

"نہیں تو۔ میں نے آپکے بتائے ہوئے سب نیموں کا پالن کیا۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ایکبار جب تمہاری دھرم پتنی تمہارے سامنے بیٹھی تھی تو تمہارے دِل میں کام واسنا پیدا ہوئی اسلئے تمہارا یہ جاپ نشپھل رہا۔"

اگرچہ مجھے ایسا کوئی موقع یاد نہ تھا کہ میری استری میرے سامنے بیٹھی ہو اور میرے

دل میں نفسانی خواہش پیدا ہوئی ہو کیونکہ مَیں تو اپنے کمرے کا دروازہ ہمیشہ بند رکھتا تھا اور
سوائے ماتا جی کے اور کسی سے بات تک بھی نہ کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی مَیں نے کہا۔
"ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی خیال میرے دِل میں اُٹھا ہو لیکن مجھے یاد نہیں۔ مَیں اپنی کوشش
میں تو پوری ودھی سے ڈٹا رہا۔

"خیر اب کیا کرنا چاہیئے" جیوتشی جی نے پوچھا۔
"کرنا کیا ہے اب دوبارہ اسے سِدھ کروں گا"
"لیکن کس جگہ"
"جہاں آپ کہیں"
"اچھا تو ٹھہرو۔ مَیں دیوی سے پوچھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر سوبھ راج جیوتشی نے چوکڑی ماری۔ اور آنکھیں بند کر کے مُنھ میں کچھ گنگناتا رہا
پانچ سات منٹ وہ اسی حالت میں رہا پھر آنکھیں کھول کر بولا۔
"حکم ہوا ہے کہ کسی ایسے شہر میں جا کر سِدھی کرو جسکے پہلے حرف میں "بھ" آتا ہو"
مَیں نے کہا۔ "بھ" تو کئی شہروں کے پہلے حرف میں آتا ہے۔ مثلاً بھیلوال بھ
اور بھوانی پور۔ آخر مَیں کہاں جاؤں۔؟

جواب دینے سے پہلے جیوتشی جی نے ایکبار پھر اپنی آنکھیں بند کیں اور اسکے بعد بولے
"آپ بھیرہ چلے جائیں اور وہاں جا کر اس منتر کی سدھی کریں ضرور بخشنی دیوی
درشن ہوں گے۔" "بہت اچھا" کہہ کر مَیں گھر چلا آیا۔

مَیں نے جب گھر والوں سے بھیرہ جانیکا ارادہ ظاہر کیا تو اُنہوں نے کافی سمجھایا اور روکنا
چاہا لیکن یہاں تو زبردست لگن تھی۔ سدھی حاصل کرنیکی دھن سوار تھی اسلئے اپنے گھر والوں

اور دوستوں کے منع کرنیکے باوجود بھی میں اگلے دن بوریا بستر باندھ کر بھیرہ جانے کے لئے گاڑی
پر سوار ہو گیا۔

وہاں پہونچتے ہی میں نے اپنی رہائش کے لئے کسی ہوٹل کی تلاش کی۔ لیکن کوئی بھی
ایسا ہوٹل نہ ملا جہاں کہ رہائش کا بندوبست ہو سکتا۔ مجبوراً مجھے وہاں کے آریہ سماج مندر
میں ٹھہرنا پڑا۔

پوجا پاٹھ کرنیکے سامان کا انتظام کرنے کے بعد میں شام کو بازار کی طرف نکلا سوچا کہ سورج
غروب ہونے سے پیشتر ہی کھانے سے فارغ ہو لوں تاکہ رات کو نیند نہ ستائے لیکن مجھے ایک
بھی وشنو ہوٹل دکھائی نہ دیا۔ ہر ہوٹل کے دو حصے تھے۔ ایک میں گوشت مچھلی کا بندوبست تھا
اور دوسرے میں دال روٹی کا لیکن دونوں حصوں کا باورچی ایک ہی تھا اسلئے مجھے روٹی کھانے
میں سنکوچ ہوا۔ اگر میں کسی اور موقعہ پر وہاں جاتا تو اتنا پرہیز کبھی نہ کرتا لیکن اس وقت تو
سدھی حاصل کرنیکا سوال تھا اسلئے شدھ وشنو بھوجن کھانا تھا۔ چنانچہ میں نے دل میں ارادہ
کر لیا کہ جب تک یہاں رہوں گا صرف دودھ اور پھلوں پر ہی گزارا کروں گا اسلئے اُس شام کو بھی
دودھ پیکر اپنے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ رات ہوتے ہی اپنے کام پر لگ گیا ساری رات بیٹھ کر جاپ کرتا رہا

صبح جب اُٹھا تو آریہ سماج کا چپڑاسی ملا۔ کہنے لگا۔

"آپ رات بھر کس کا جاپ کرتے رہے ہیں؟"

"گائتری منتر کا" میں نے جھوٹ بولا۔

"لیکن اس میں دھوپ اور اگربتی کی کیا ضرورت تھی؟"

یہ بھی ضروری چیزیں ہیں۔ میں گائتری منتر کی سدھی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُسے
ٹالتے ہوئے کہا اگرچہ میرے اس جواب سے اس کی پوری تسلی نہ ہوئی تھی لیکن پھر بھی اُس نے میرے جاپ کے

بارے میں مزید پوچھ تاچھ نہ کی۔

اسی طرح دن گذرتے گئے، اور بھیرہ میں تین ہفتے پھل اور دودھ پی کر میں نے اپنا جاپ پورا کیا لیکن افسوس بھگشنی دیوی جی کے درشن پھر بھی نہ ہوئے جس دن لاہور واپس جانا تھا اس دن طبیعت سخت اُداس تھی کیونکہ اپنی طرف سے تو میں نے کوئی کمی سدھی حاصل کرنے میں نہ رکھی تھی۔ لیکن پھر بھی ناکام رہا یہی رنج مجھے پریشان کرتا رہا خیر میں لاہور آنیوالی گاڑی میں سوار ہو گیا گوجرانوالہ پہنچتے ہی اُس ڈبہ میں (جس میں میں سوار تھا) ایک پنڈت جی مہاراج آگئے اتفاق سے انھیں جگہ میرے قریب ہی ملی۔ دورانِ گفتگو علم جیوتش کا ذکر آگیا وہ بولے۔

" جیوتش علم ہے تو بالکل سچا لیکن اسے جاننے والے بہت کم ہیں زیادہ تر جیوتشی خود کو اور دوسروں کو دھوکا دیکر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں اور علم جیوتش کو بدنام کرنیکا باعث بنتے ہیں

میں نے جب اُنکو اپنی رام کہانی سنائی تو وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔

" بابو جی آپکو بہت بڑا دھوکہ دیا جارہا ہے جن جیوتشی جی کا آپنے ذکر کیا ہے وہ تو کوئی ٹھگ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ جب میں خود اسکی آزمائش کر بیٹھا ہوں تو اس میں پھر دھوکے کا کیا سوال؟

" کیا آزمائش کی آپ نے؟"

" اُس نے بنا پوچھے ہی میرے دلی سوالات بتا دیئے۔"

یہ سُنکر وہ پنڈت جی بولے۔ بھلا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے! اس طرح تو میں بھی آپکے سوالوں کا جواب دے سکتا ہوں۔

مجھے اس کے جواب سے تعجب ہوا اور میں نے اسکے دعوے کی سچائی کا ثبوت مانگا!

" لاہور پہنچکر میرے ساتھ میرے مکان پر چلیا پھر میں آپکی پوری تسلی کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنی گفتگو بند کر دی۔

مَیں خیالات کے سمندر میں ڈوب گیا۔ سوچنے لگا کہ بظاہر تو یہ شخص بھی سیدھا سادہ اور اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اس کے اندرونی حالات بھگوان ہی جانے۔ اگر اس شخص نے میرے سوالوں کو بنا بتائے ہی جانچ لیا تو ماننا پڑیگا کہ یہ بھی کوئی روحانی آدمی ہے اسی سے مُستقبل کے لئے کچھ دریافت کروں گا اس قسم کے خیالات دِل میں اُٹھتے رہے اور مُنتشر ہوتے رہے دِل میں یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ اس جیوتشی ؒ کی بھی آزمائش کی جائے۔

گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر جا کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں اُترے اور ایک ٹانگہ میں سوار ہو کر اُس کے مکان پر پہنچے۔ وہ مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھا کر اندر گیا اور کچھ دیر کے بعد ایک کاپی ہاتھ میں لئے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوا۔ کہنے لگا۔

"آپ اس کاپی پر اپنے دِلی سوالات لکھ دیں"۔

مَیں نے دو چار غیر معمولی سوالات لکھ دیئے اور وہ کاپی اسکی طرف بڑھا دی جس کاغذ پر سوالات لکھے تھے۔ اس کاغذ کو اس نے کاپی سے جُدا کر کے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا

"اگر میں یہی سوالات خود بخود لکھ دوں تو آپ مجھے کیا سمجھیں گے"۔

"یہی کہ آپکے پاس بھی کوئی سِدھی ہے"۔

وہ ہنسا "ہاں سِدھی تو ضرور ہے لیکن کسی دیوی دیوتا کی نہیں بلکہ بھگوان کی کرپا سے زیل بجلی کی

مَیں اسکی باتوں کا کچھ بھی مفہوم نہ سمجھ پایا اور ٹکٹکی لگائے اسکے چہرے کو دیکھتا رہا۔

کچھ دیر رُک کر وہ پھر کہنے لگا۔

"دیکھئے مَیں آپکو زیادہ سشش و پنج میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ان سوالات کو جاننے کے لئے علم جیوتش کی ضرورت نہیں صرف تھوڑی چالاکی اور کاربن (Carbon) پیپر چاہیئے یہ دیکھئے

اُس نے دو صفحے اُلٹتے ہوئے کہا۔ "سب خالی ہیں نا"

"جی ہاں!"

لیکن یہ اُس نے دو صفحے اور اُلٹاتے ہوئے کہا۔

"کاربن پیپر" ۔ مَیں بے ساختہ بول اُٹھا۔

"ہاں ــــ یہی ہے آپکی سِدھی دیوی جسکی وجہ سے آپکو سوبھ راج نے گمراہ کیا تھا۔

مَیں نے کاربن اُٹھایا تو نیچے میرے تمام سوالات کا عکس تھا۔ ایکدم میرا سر گھوم گیا۔

میرے دماغ نے اور کچھ سوچنے سے انکار کر دیا۔ سر چکرانے لگا اور مجھ پر نیم بیہوشی کی حالت طاری ہو گئی

اچانک مجھے اُس پنڈت جی کی آواز نے چونکا دیا۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ کاربن پیپر کا عکس ایک کاغذ کی تہہ کے نیچے ہی کام دے سکتا ہے۔

لیکن آپنے دیکھا کہ لکھے ہوئے صفحہ سے چار صفحے چھوڑ کر بھی اگر کاربن پیپر رکھا جائے تو پانچوں

صفحے پر عبارت کا عکس صاف صاف آجاتا ہے۔

"دھنیہ باد" مَیں نے عقیدت سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا آپنے مجھے اس بدمعاش کے جال سے

نکالدیا۔ مَیں آپکا ہمیشہ ممنون رہوں گا اب مجھے آگیا دیجیئے۔ مَیں اُس پاجی کی ابھی جا کر خبر لوں گا

چھاؤنی پہونچتے ہی مَیں اپنے گھر کی بجائے سوبھ راج کے مکان پر گیا دیکھا کہ وہ حضرت

پہلے کی مانند محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کچھ گھبرا سے گئے لیکن پھر سنبھل کر بولے

"آیئے خوشدل جی۔ کیا کچھ رہا؟"

اس کا یہ سوال سُنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور سوچا کہ دو چار موٹی موٹی

گالیوں کے ساتھ اسکی فریب کاریوں کا پردہ چاک کر دوں لیکن دوسرے ہی لمحہ دماغ نے کچھ سوچکر

دِل کو سمجھایا اور قابو میں رکھا۔ بناوٹی مسکراہٹ سے مَیں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہو گیا ہے مگر ایک ذرا سی کسر رہ گئی ہے اسکی بابت آج رات کو ایکانت میں عرض کروں گا۔

"بہت اچھا تو اب جا کر آرام کیجئے۔ سفر میں اکثر تھکاوٹ ہو جاتی ہے رات کو تقریباً ۹ بجے تشریف لے آئیں۔ اس وقت میں بھی اکیلا ہی ہوں گا۔"

میں نمستے کر کے گھر چلا گیا۔ پتا جی نے مذاقاً پوچھا۔

"کیوں ارشی جی سِدھی حاصل ہو گئی کہ نہیں؟ اب تو ہم سب کے بھاگیہ کھُل جائیں گے۔ سوبھو راج کی طرح اب تو لوگ آپکے درشنوں کو بھی آیا کریں گے سر کے سب یا تھا ٹیکیں گے پھل۔ مٹھائی۔ بھینٹ کرینگے۔ اور پوجا پاٹھ کروانے کے لئے نقد نارائن بھی دینگے۔"

پتا جی نے جو کچھ بھی کہا میں خاموش کھڑا سنتا رہا جواب میں صرف اتنا ہی بولا۔

"میں آپ سے اس معاملہ میں بحث نہیں کرنا چاہتا اور میں جس ارادے سے یہ کام کر رہا ہوں اسے بھگوان ہی جانتا ہے وقت آنے پر نہ صرف آپکو بلکہ سب کو معلوم ہو جائیگا۔"

خیر جو تمہارے جی میں آئے کرو مگر اتنا سُن لو کہ سِدھی وِدھّی کوئی چیز نہیں۔"

یہ کہکر پتا جی ایک طرف کو چل دیئے۔ اور میں اپنے کمرے میں جا کر گہرے سمندر کے خیالات میں ڈوب گیا۔

شام کو جب میرا دوست شیام لال ملا تو میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا اس کو بھی سوبھو راج نے ایک منتر آتم شدھی اور بھگوت پراپتی کا بتایا تھا اور وہ بھی رات کو سونے سے پہلے صرف ایک مالا اُس منتر کی جپا کرتا تھا۔

سوبھو راج کی ہدایت کے مُطابق اُس نے مجھے اپنا منتر نہ بتایا تھا اور نہ ہی میں نے اس سے کبھی پوچھا لیکن میری باتیں سُنکر اور دو تین واقعات جیوتشی جی کے متعلق سُنکر شیام لال کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ حضرت پورے چار سو بیس ہیں اور کوئی سِدھی وِدھی ان کے پاس نہیں۔

شام لال کے بتانے پر پتہ چلا کہ اُسے بھی میرے والا منتر دیا گیا تھا لیکن اسکے جاپ کا طریقہ
مختلف تھا۔ اور اُس کا مقصد بھی دوسرا یعنی موکھش حاصل کرنا تھا۔

رات کو جب میں سوبھ راج کے پاس پہنچا تو وہ اکیلا بیٹھا تھا میں نے اُسے کہا کہ اگر بار بھر
یکشنی دیوی سے مجھے چند باتیں پوچھ دے اُس نے وعدہ کیا کہ چند دنوں کے بعد ایسا کروں گا لیکن یہاں
کس کو انتظار تھا میں نے ایک دیگر واقف شخص کو اس امر کے لئے تیار کیا کہ وہ سوبھ راج کو اپنا
گرو بنائے اور اپنے متعلق سدھی سے سوالات پوچھے چنانچہ جب سوبھ راج نے اُسے ایکدن صبح
چار بجے بلایا تو میں بھی اُسی بیٹھک کے باہر پہنچ چکا تھا۔

سوبھ راج نے ایک کاپی اسکے سامنے رکھی اور ایک خالی صفحہ پر سوالات لکھنے کے لئے کہا سوالات
لکھ چکنے کے بعد جب جیوتشی جی نے وہ صفحہ پھاڑ کر اُسے اپنی جیب میں رکھنے کے لئے کہا تو اُس شخص (جس کا
نام موہن لال تھا) نے کاپی میں سے پانچ سات صفحے پھاڑ لئے۔ چار پانچ صفحوں کے بعد ایک کاربن پیپر
بھی وہاں رکھا ملا۔ سوبھ راج نے جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے وہ کاغذ چھین لئے۔ موہن لال نے
مجھے آواز دی۔ اور دوسرے لمحے میں بیٹھک کے اندر تھا۔ سوبھ راج کا رنگ فق ہو گیا۔ موہن کے سوا
والا کاغذ اُس نے نگل لیا۔ میں اُس وقت غصہ سے پاگل ہو رہا تھا اسلئے جو میرے مُنھ میں آیا میں
بکتا رہا۔ سوبھ راج نے میری کافی منت سماجت کی۔ لیکن میرا غصہ شانت نہ ہوا اور میں نے اُس سے
صاف صاف کہدیا کہ کل شام سے پہلے پہلے تمہارے " کالے کارناموں " کے متعلق ایک پوسٹر

اُس دن سوبھ راج کے جو پریمی مجھے ملے میں نے سب کو اُسکے فریب کا حال سُنایا۔ اُسی
دو تین اشخاص نے مجھے بتایا کہ سوبھ راج جپ کے نام پر ان سے سینکڑوں روپیہ وصول کر
لیکن اُن کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا۔

میں ایک نوجوان پنڈت سے ملا جس کو سوبھ راج نے خاص طور پر باہر سے بلایا تھا۔ اُس

جب میں نے دھمکی دی۔ کہ پولیس تمہیں اور تمہارے گرو کو کل گرفتار کرلے گی تو وہ رونے لگا۔
اُس نے اقبال کرلیا کہ جتنا روپیہ کسی منتر کے جپ کرنے کا اُسے ملتا ہے اُس کا آدھا حصہ وہ سوبھراج
کو دیتا ہے مجھے اُس کی صاف بیانی پر ترس آگیا۔ اسلیئے میں نے اُسے رائے دی کہ وہ آج شام ہی کو اپنے
وطن چلا جائے ورنہ کل اگر کسی اُلجھن میں وہ پڑ گیا تو میں کوئی مدد نہ کرسکوں گا۔

مجھے رات کو علم ہوا کہ وہ نوجوان بغیر سوبھراج سے ملے اپنے وطن چلا گیا ہے۔ اس دن دفتر
(یہ جیوتشی جی .S .E .M میں کلرک تھے) سے واپس آکر جیوتشی جی نے اپنی بیٹھک کا دروازہ نہ کھولا۔
رات کو ۱۰ بجے کے قریب سوبھراج میرے مکان پر آیا کہنے لگا کہ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں
میں نے کہا کہ میں اب تم سے عدالت ہی میں بات کروں گا لیکن وہ بضد رہا۔ اتنے میں میرے پتا جی بھی
آگئے جیوتشی نے اُن کی خوشامد کی اور اُنہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اسکے ساتھ میونسپل باغ میں جاؤں۔
اور اُس کی باتیں ضرور سنوں چنانچہ میں اسکے ساتھ باغ میں پہنچا۔ اُس باغ میں ایک پبلک لائبریری
بھی تھی جو اس وقت بند ہوچکی تھی اسلیئے وہاں بھیڑ بھاڑ مطلق نہ تھی۔

ایک چھوٹی سی نہر وہاں بنی ہوئی تھی جس کی سیڑی پر ہم دونوں بیٹھ گئے سوبھراج نے نہر کا
پانی ہاتھ میں لیا اور کہنے لگا کہ یہ گنگا جل لیکر میں قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ کسی کو جیوتش کی آڑ میں
دھوکا نہ دوں گا۔ میں نے پوچھا جن لوگوں کو تم اب تک لوٹ چکے ہو اُن کا کیا بنے گا؟
آپ جن جن اپنے واقف کاروں کا روپیہ واپس کرنے کے لئے کہیں گے میں واپس کردوں گا لیکن بھگوان کیلیئے
میرے خلاف نہ تو اشتہار لگوا لو اور نہ مجھ پر مقدمہ چلاؤ وہ بہت گڑگڑایا بلکہ رونے بھی لگا۔ آخر میں نے اُس سے وعدہ کرلیا
کہ اُس نے جو کچھ اب تک کیا اسکے متعلق میں کوئی قدم نہ اُٹھاؤں گا لیکن آئندہ اگر اُس نے جپ کی آڑ میں
کسی سے روپیہ لیا، یا اپنی سدھی کے نام پر کسی نوجوان کو میری طرح گمراہ کیا تو یقیناً اُسے جیل میں بھجوانے
سے کبھی پیچھے نہ ہٹوں گا۔ اُس نے بچن دیا کہ وہ آئندہ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرے گا۔

اگرچہ میں نے سوبھراج کے خلاف کوئی اشتہار وغیرہ نہ نکالا لیکن جو لوگ مجھ سے اُس کی بابت پوچھتے تھے میں اُن سے صاف صاف اپنی آپ بیتی کہہ دیتا ۔ چونکہ سوبھراج کی دیگر کئی "آسامیوں" نے بھی اسکے فریب اور پاکھنڈ کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا تھا اسلئے اُس کی دوکانداری ٹھپ ہو گئی ۔

ٹکڑم بازوں کو چیتاونی

اے فریب و مکر کے پتلو ۔ وطن کے دشمنو
شر پسندو ۔ جھوٹ کے بندو ۔ خدا سے منکرو
تم بڑھے جاتے ہو کیوں اتنا بدی کی راہ پر
کس لیئے انجام سے غافل ہوئے ہو اس قدر
چند روزہ زندگی کی عیش و عشرت کے لیئے
کرتے ہو مکاریاں تم جھوٹی شہرت کے لیئے
چھپ نہیں سکتیں تمہاری اب یہ فتنہ سازیاں
ایک دن ہو جائیں گی ظاہر یہ ٹکڑم بازیاں
جب تمہاری حرکتیں بد ہونگی لوگوں پر عیاں
تھوکے گا منہ پر تمہارے تب ہر اک پیر و جواں
مان کر خوشدل کا کہنا راہِ بد کو چھوڑ دو
اپنے ہاتھوں اپنے پاپوں کے گھڑوں کو پھوڑ دو

واقعہ ۲

منتر کی کرامات

بچپن میں منتر شکتی کے متعلق ہزاروں قصے کہانیاں سُننے کے باوجود بھی مَیں منتر جنتر کی اصلیت کا دِل سے قائل نہ ہو سکا لیکن ایکبار میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے منتر جنتر کی طاقت کا ہمیشہ کیلیے قائل کر دیا۔

مَیں اب دِل کی گہرائیوں سے یہ مانتا ہوں کہ منتر جنتر جادو ٹونے میں ضرور کچھ نہ کچھ اثر ہے بشرطیکہ اسکے جاننے والا عامل اور علم سے اچھی طرح واقف ہو۔

علم جیوتش کو بھی مَیں ایک ڈھکوسلا ہی سمجھتا تھا۔ لیکن برندابن کے ایک بردھ تھا سے میری ملاقات ہر دوار میں ہوئی جس نے میری سابقہ زندگی کا پورا نقشہ میرے سامنے رکھدیا نیز دو چار پیش گوئیاں آئندہ زندگی کے لئے بھی کر دیں جو اپنے وقت پر حرف بحرف ٹھیک ثابت ہوئیں۔ اسلئے اب میں اس علم کی صداقت کو بھی مانتا ہوں۔

یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ آجکل بے شمار جیوتشی سنسکرت کے پراچین جیوتش گرنتھوں کو پڑھے بغیر اِدھر اُدھر کی گپ شپ لڑا کر لوگوں میں جیوتش و دیا کو بدنام کر رہے ہیں لیکن حقیقت محض اتنی ہے کہ یہ علم نہایت مرصع ہے اور سچا۔ گو اس کے جاننے اور سمجھنے والوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں میں صرف ایک دو ہے۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی صوبائی گورنمنٹ کے ہاتھوں میں

ایک ایسا خوفناک ہتھیار آگیا جس سے کام لیکر وہ مخالفوں کو جیل کی چہار دیواری میں بغیر مقدمہ چلائے کافی عرصہ کیلئے بند کر سکتے تھے اُس کا نام تھا "ڈیفنس آف انڈیا (DEFENCE-OF INDIA ACT) ایکٹ۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں مجھے پتہ چلا کہ سر سکندر کی منسٹری (MINISTRY) اس قانون کے مطابق مجھے بھی گرفتار کرنا چاہتی ہے کیونکہ میرے اخبار ہفتہ وار" بیر بیراگی" میں شائع شدہ مضامین، نظموں اور آرٹیکلوں سے وہ سخت ناراض تھی کئی دفعہ مجھے وارننگ (WARNING) مل چکی تھی اور اُس وقت کی پنجاب گورنمنٹ موقع کی تلاش میں تھی کہ کب وہ مجھے جیل کی سلاخوں کے اندر قید کرلے مگر بھگوان نے مجھے ہر بار اسکے چنگل میں پھنسنے سے بچالیا (ڈیفنس ایکٹ) میں بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھ کر میں نے پرچہ کو بند کر کے پنجاب چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ اور اس مقصد کے پیش نظر میں لاہور گوالمنڈی چھوڑ کر دھرم پورہ میں آگیا

دھرم پورہ لاہور اور لاہور چھاؤنی کے درمیان ایک بستی ہے میں نے وہاں کرایہ کا ایک مکان لیکر رہنا شروع کر دیا اور آئندہ کے بارے میں اپنا پروگرام سوچنے لگا لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی کاروبار بند ہو جانے کے باعث مالی حالت پہلے ہی پتلی ہو چکی تھی اب ایک اور مصیبت نے منہ دکھایا۔ میرے دائیں انگوٹھے کا ناخن لیکایک سوج گیا دو چار دنوں ہی میں تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ انگوٹھے کے ساتھ ہاتھ پر بھی اثر ہونے لگا اور میں دائیں ہاتھ سے کام کرنے کے بالکل ناقابل ہوگیا۔ ایک دو ڈاکٹروں کو دکھلایا جنھوں نے ہاتھ کٹوا دینے کی صلاح دی مجھے یہ بتایا گیا کہ کوئی خطرناک زہر ہاتھ میں سرایت کر گیا ہے اور اگر جلد از جلد ہاتھ کو نہ کٹوایا گیا تو مجھے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

میں سخت پریشان اور مایوس تھا۔ دایاں ہاتھ کٹوا کر میں زندگی کی جدوجہد میں جو حصہ لے سکوں گا اس کا تصور مجھے خوف زدہ کرنے لگا کئی دنوں کے سوچ وچار کے بعد میں نے طے کرلیا کہ

ہاتھ ہرگز نہ کٹواؤں گا چاہے بھلے ہی چلا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹروں کی طرف سے مایوس ہو کر اور اپنے آپکو بھگوان کے حوالے کر کے میں نے آئندہ کے لیئے دوا دارو کا استعمال بھی بند کر دیا۔ اس حالت میں مجھے تقریباً ایک مہینہ گذر گیا اور تکلیف دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ اب میرا سارا ہاتھ پھول کر کُپّا بن چکا تھا اور اسمیں سخت جلن محسوس ہوتی تھی۔

ایکدن شام کے وقت میں اُداس اور پریشان نہر کے کنارے اپنی دھرم پتنی کے ساتھ کھڑا تھا کہ ایک مزدور پھٹے پرانے کپڑے پہنے اُدھر سے گذرا۔ میرے ہاتھ کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔ کب سے تکلیف ہے آپکو؟ تقریباً ایک ماہ سے" میں نے جواب دیا۔ "آپنے آپریشن تو نہیں کروایا؟" "نہیں"

پھر تو اسکا علاج میں کر سکتا ہوں۔ کیا دیسی دوا ہے؟ میں نے بڑی لاپرواہی سے پوچھا "نہیں منتر شکتی ہے!" میں حیرت سے اُس کا منہ دیکھنے لگا پھر سوچکر میں نے کہا۔ "مجھے تو منتر شکتی پر بالکل وشواس نہیں" "آپکے بشواس نہ کرنے سے میرا کام ناکام نہیں رہ سکتا"۔ تو کیا تم کو یہ اُمید ہے کہ تم میرے ہاتھ کو بالکل تندرست کر دو گے اور وہ بھی کسی دوا کے بغیر صرف منتر شکتی سے' میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ دریافت کیا۔

اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہاں اپنے گرو اور بھگوان کی کرپا سے"۔

"تو پھر کتنے روپے لو گے"۔

"کس بات کے"؟

"میرا ہاتھ ٹھیک کرنے کے"

"ایک پیسہ بھی نہیں"

"بالکل مفت"

"جی ہاں"

" علاج کروانے میں میرا کُل کتنا خرچہ اُٹھے گا ؟ میں نے اسکی باتوں پر شک کرتے ہوئے اور معاملہ کو صاف کرنیکی نیت سے پوچھا "

" صرف اڑھائی روپیہ " ——— " کیا کچھ دوا خریدنی پڑے گی ؟ " نہیں جب آپ کو بالکل آرام آجائے تو آپ کو منگل وار کے دن ایک روپیہ کا آٹا ایک روپیہ کا گھی اور آٹھ آنے کا گڑ لیکر موٹی موٹی روٹیاں پکواکر چھوٹے چھوٹے بچوں میں تقسیم کرنی ہونگی "۔

" مجھے منظور ہے " میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا یہ بات چیت ہونے کے بعد وہ میرے مکان تک آیا۔ برآمدے میں اس نے ایک لوٹا جل کا لیکر چھڑکا اور پھر ایک چٹائی بچھائی گئی۔ مجھے چٹائی پر بٹھاکر مجھ سے قریباً پانچ سات ہاتھ کے فاصلے پر اُس نے ایک لکیر سی کھینچدی مجھے ہاتھ کو اس لکیر پر رکھ دینے کے لئے کہا۔ میں نے چپ چاپ ہاتھ وہاں رکھدیا۔

اب اُس شخص نے اپنا ایک جوتا اپنے دائیں ہاتھ میں لیکر کچھ پڑھنا شروع کر دیا دو چار منٹ مُنہ میں کچھ بڑبڑانے کے بعد مجھ سے بولا۔

" دیکھئے آپ ہاتھ کو نہ روکنے کی کوشش کریں اور نہ آگے لے جانے کی اور اگر یہ آگے کو چلنا چاہے تو آپ اس کو زبردستی نہ روکیں۔ " اتنا کہہ کر اُس نے زور زور سے جوتے کو زمین پر مارنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اونچی آواز سے چلانے لگا۔

" چلو چلو آگے آؤ ورنہ جوتا لگاؤں گا۔ یکایک میں نے اپنے دہنے ہاتھ میں بجلی کی ایک رو سی محسوس کی اور دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہاتھ آگے جانا چاہتا ہے میں نے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اب آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھنے لگا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ دل میں خواہش نہ ہونیکے باوجود ہاتھ اُس شخص کے کہنے کے مطابق کبھی آگے جاتا اور کبھی پیچھے لوٹتا۔

اب اُس شخص نے پھر کچھ مُنہ میں بڑبڑانا شروع کیا اور دوسرے لمحہ میں وہ پھر چلّایا۔

"لگاؤ کان کو ہاتھ پھر کبھی تنگ نہ کرنا شرم نہیں آتی۔ ایک شریف آدمی کو اتنا پریشان اور تنگ کر رہے ہو۔"

اور مَیں نے محسوس کیا کہ ہاتھ میرا خود بخود دہنے کان کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ درد ضرور ہوا لیکن ہاتھ میرا کان تک جا ہی پہنچا پھر اُس نے دوسرے کان کو ہاتھ لگوایا۔

"بس آج اتنا ہی کام ہو گا۔ کل اسی وقت مَیں پھر آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور مجھے جے رام جی کی کہہ کر چلا گیا۔"

اگلے دن شام کو وہ مزدور پھر آگیا اور پہلے دن کی طرح میرے ہاتھ پر عمل کیا چنانچہ مجھے اُسی دن روپیہ میں چار آنے آرام محسوس ہونے لگا۔ وہ جلن، ٹیسیں اور وہ بے چینی اب کم ہونی شروع ہو گئی۔ تین دن تک برابر ایسا ہوتا رہا وہ ہاتھ کو حکم دیتا اور میرا ہاتھ اسکی مرضی کے مُطابق کام کرتا۔ تیسرے دن مجھے درد کی شدت میں بہت کمی محسوس ہوئی اور اُس رات ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

میری آنکھ لگ گئی مَیں نے خواب میں دیکھا کہ کچھ لوگ دوڑے جا رہے ہیں۔ عورتیں، بچے چلّا رہے ہیں سنسان بازار، ہو کا عالم دوکانیں بند اور چبوتروں پر بیٹھے لوگ خوف و ہراس سے کانپ رہے ہیں اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان عورت ایک بچّے کو گود میں لئے ہوئے سڑک پر بھاگی چلی آ رہی ہے اسکے پیچھے ایک عجیب قسم کا جانور جو بطخ کی شکل کا تھا۔ لیکن اُس کی چونچ بہت چوڑی اور قد بطخ سے بہت اونچا تھا۔ بھاگا آ رہا ہے۔ عورت مدد کیلئے چلّا رہی تھی لیکن مکانوں اور دُکانوں پر کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی کو بھی اسکی مدد کرنیکی ہمّت نہیں پڑتی تھی۔

مَیں بھی ایک دوکان کے چبوترے پر کھڑا اُس آنیوالی عورت کو حیرانگی سے دیکھ رہا تھا میرا جسم کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا اتنے میں وہ عورت میرے قریب آگئی اور اپنا بچّہ

سڑک پر پھینک کر خود ایک دوکان کے چبوترے پر پناہ لینے کے لئے چڑھ گئی وہ خوفناک جانور بچے سے اب چند قدم کے فاصلے پر تھا بچے کو دیکھ کر اُس عجیب المخلوق جانور نے اپنی چونچ کھولی اور ایک عجیب و غریب آواز نکالتے ہوئے بچے کی طرف بڑھا دوسرے لمحے نہ جانے کس جذبہ کے زیرِ اثر مَیں نے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ بچے کو اُٹھایا اور اسکی ماں کی طرف پھینکدیا۔ یہ کام اتنی جلدی اور اتنی پھرتی سے ہوا کہ مَیں خود حیران رہ گیا۔ لوگوں نے واہ واہ کے نعرے بلند کئے۔ شاباش شاباش کی آوازیں فضا میں گونج اُٹھیں۔ مَیں اپنی اس جرأت پر خوش ہو رہا تھا کہ میری نظر اس جانور پر پڑی میرا رواں رواں خوف سے کانپ اُٹھا۔ وہ ظالم اپنی خوفناک آنکھوں سے مجھے ڈراتے ہوئے مجھے کاٹنے کے لئے میری طرف بڑھا۔ جب اُس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو مَیں نے سڑک پر بھاگنا شروع کیا۔ مَیں اپنی پوری قوت سے بھاگ رہا تھا اور وہ جانور ملک الموت کی طرح میرا پیچھا کر رہا تھا بہت دور جاکر مجھے ایک چھوٹی سی دیوار دکھائی دی۔ آگے راستہ بند تھا۔ مَیں نے پوری طاقت لگاکر چھلانگ لگادی۔ اور دیوار پر چڑھ گیا۔ وہ دیوار کوئی چھ سات فٹ بلند تھی دوسری طرف ایک گہری کھڈ تھی جہاں کودنا جان بوجھ کر موت کے مُنہ میں جانا تھا۔ اتنے میں وہ بھیانک جانور بھی دیوار کے نیچے آپہنچا اور اپنی چونچ کھول کر اور پنجوں کے بل کھڑا ہو کر مجھے کاٹنے کی کوشش کرنے لگا میرے پاؤں اور اسکی چونچ کے درمیان کوئی آدھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ اپنی پوری طاقت سے اُچھل کر میرے پاؤں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا دل مارے خوف کے سینے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ اسکی ہر کوشش میرے لئے پیغامِ موت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک آدھ بار مزید کوشش کرنے سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیگا۔

موت کو اس طرح سامنے دیکھ کر پہلے تو میرے حواس باختہ ہو گئے لیکن دو تین منٹ کے وقفہ نے میرے دل سے خوف کو دُور کر کے مجھے دلیری اور بہادری سے اس کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کر دیا۔

میں نے سوچا کہ اب زندگی تو بچتی نظر نہیں آتی کیوں نہ پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کروں اور بہادروں کی موت مروں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے میں اس پر غالب آجاؤں۔ یہ فیصلہ کرتے ہی نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ جب اس عجیب الخلقت جانور نے آخری بار کوشش کر کے میرے پاؤں کو پکڑنے کی کوشش کی تو میں نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا گلا پکڑ لیا ایک ہاتھ سے گلا پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس پر دباؤ ڈالا اور پوری طاقت سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ اب وہ جانور پھڑ پھڑانے لگا۔ اسکی خوفناک آنکھیں باہر نکل پڑیں اسکے پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور میں دیوار پر جھکا ہوا اس کا گلا دبا رہا تھا۔ ایک چیخ کے ساتھ میری آنکھیں کھل گئیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں اپنے خراب اور تکلیف دہ انگوٹھے کو دوسرے ہاتھ سے دبا رہا ہوں۔ انگوٹھے سے خون اور پیپ جاری ہے میری چیخ کی آواز سنکر میری رفیقۂ حیات بھی جاگ چکی تھی اور لیمپ روشن کر کے میری چارپائی تک پہنچ چکی تھی۔ میرے ہاتھ کی حالت دیکھ کر اُسے سخت پریشانی ہوئی۔ فوراً روئی سے بہتے ہوئے مواد کو صاف کیا اور مجھ سے انگوٹھے کے دبانیکی وجہ پوچھی۔ میں نے اُسے اپنا خواب سُنایا یہ سُنکر اُسے بھی حیرت ہوئی لیکن اسکی زبان سے بے ساختہ نکل گیا اب آپکا ہاتھ بالکل ٹھیک ہو جائیگا" اُمید تو مجھے بھی ہے" میں نے جواب دیا۔ ہاتھ کی طرف دیکھا تو اُس سے مواد بہہ رہا تھا صرف زخم کا نشان دکھائی دے رہا تھا لیکن تکلیف سب دُور ہو چکی تھی۔

میں اُس رات آرام کی نیند سویا۔ صبح اُٹھتے ہی جب دروازہ کھولکر باہر نکلا تو اس مزدور کو سامنے کھڑا دیکھا۔ میں نے اپنے خواب کا اُسے سارا حال سنایا اور ہاتھ اسکی طرف بڑھایا وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ اور با آواز بلند بولا۔ "بس اب آپکا پاپ کٹ گیا۔" ذرا سا کام باقی ہے اسے میں ابھی پورا کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے میرے انگوٹھے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کر پوری طاقت سے دبایا۔ اب کی بار نہ خون نکلا نہ پیپ۔ ایک سفید رنگ کا لمبا سا کیڑا زخم سے

باہر نکلتا دکھائی دیا۔ دوسرے لمحے وہ زمین پر رینگنے لگا یہ کیڑا نہایت باریک اور دو اِنچ لمبا تھا اُس مزدور نے اپنے پاؤں کا جوتا اُتار کر فوراً کیڑے کو کچل دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا لو اب میرا کام ختم ہو گیا ہے آپ کا زخم چار پانچ دن تک بھر جائیگا لیکن تکلیف کی جڑ کٹ چکی ہے۔ منگلوار کو بتاشہ ضرور بانٹ دینا۔ یہ کہہ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہتا ہوا باہر نکل گیا میں اس تکلیف سے چھٹکارا پالینے پر اتنا خوش تھا کہ گویا مجھے نئی زندگی ملی ہو میں اپنے محسن کی خدمت ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن وہ میرے منھ سے شکریہ کے چند الفاظ سُنے بغیر ہی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

اگلے دن میں نے اپنے ایک دوست سے کچھ روپئے لئے اور مزدور کے گھر پہنچا جب میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کچھ روپے دینے چاہے تو وہ بولا " پنڈت جی میں یہ روپئے تو کیا ایک پیسہ بھی نہ لوں گا۔ کیونکہ اگر میں نے آپ سے اس خدمت کا معاوضہ روپیہ کی صورت میں لے لیا تو میرے پاس جو منتر شکتی ہے وہ نشٹ ہو جائیگی اور میں آئندہ آپ جیسے کسی بھی دکھی انسان کی خدمت نہ کر سکوں گا۔"

یہ سُنکر میں نے روپیہ دینے کا پھر اصرار نہ کیا اور دِل کی گہرائیوں سے اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوا اپنے گھر واپس آ گیا۔

میں نے منگلوار کے دن اس نیک دل مزدور کے کہنے کے مطابق میٹھی روٹیاں پکوا کر بچوں میں تقسیم کر دیں۔

چار پانچ دنوں کے بعد میرا زخم بھی بھر گیا۔ اور انگوٹھے کا ناخن بھی خود بخود اُتر گیا۔ میرا اور میرے سب رشتہ داروں نیز واقف کاروں کا خیال تھا کہ نیا ناخن بالکل صاف اور مانند قدرتی نکلے گا۔

وائے قسمت عجیب قسم کا نوکیلا سا ناخن نکلا ہے آج تک تین چار دفعہ میں اس انگوٹھے کے ناخن کو خود جڑ سے اُکھاڑ چکا ہوں صرف اسی اُمید پر کہ شاید نیا ناخن اچھا اور صاف اُگ آئے۔ لیکن نہ جانے قدرت کو کیا منظور ہے کہ ناخن مانند اصلی نکلتا ہی نہیں۔ مجھے اب تکلیف تو رتی بھر نہیں لیکن ناخن کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر لیا کرتا ہوں ہاں اس ناخن کا اتنا فائدہ ضرور ہے کہ جب کبھی اس پر نظر پڑتی ہے تو گزرے ہوئے مصیبت کے دن یاد آنے کے علاوہ دِل میں ایشور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جنتر منتر کی بات کے متعلق سب شکوک دور ہو جاتے ہیں۔

سدھ پُرش

سنہ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں میرے ایک مہربان دوست پنڈت جگدیشور نے اپنے گرُو جی کے متعلق عجیب و غریب باتیں سُنائیں لیکن میں نے چنداں اُن کو اہمیت نہ دی۔ کیونکہ عقل انسانی ان کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے لیکن اسی سال کے آخر میں مجھے سخت ناموافق اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق میں نے اس سدھ پرش (اپنے دوست پنڈت جگدیشور جی کے گورو مہاراج) جی سے ملنے کی ٹھانی چنانچہ جموں جانیکا پروگرام بنانے لگا۔ کیونکہ وہ سجن جموں کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے ارادہ کیا جنوری سنہ ۱۹۵۴ء میں وہاں جاؤنگا پنڈت جگدیشور نے مجھے ایکدن یہ خوشخبری سُنائی کہ اُن کے گرو دیو جنوری سنہ ۱۹۵۴ء کے آخری ہفتہ میں ہردوار پہنچیں گے اور چند دن وہاں قیام کرنیکے بعد الہ آباد جائیں گے چنانچہ میں اپنے واقف کار مسٹر ایم۔ ایم ورما کے ساتھ ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۵۴ء کو ہردوار پہنچا۔ وہاں میرے دوست پنڈت جگدیشور ملے جو اپنے گورو کی سیوا کے لئے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے ان کی وساطت سے اس سدھ پُرش سے مُلاقات ہوئی۔ دیکھا کہ وہ ایک سیدھے سادھے کم تعلیم یافتہ اور کٹر ٹائپ کے دھارمک براہمن ہیں۔ میں نے جب اُن سے اپنی پریشانی اور بیماری کا حال پوچھا کہنے لگے میں تو کچھ نہیں جانتا۔ ماتا وشنو دیوی کی مجھ پر کرپا ہے جب میں پوجا کرتا ہوں۔ تب وہ سویم پرویش کر جاتی ہیں۔ اس وقت جو آپ کہنا چاہیں کہیں۔ میں نے عرض کی کہ مجھے ایسی باتوں پر قطعاً وشواس نہیں۔

آپکی تعریف میرے دوست جو آپکے خاص چیلے ہیں اکثر مجھ سے کرتے رہتے ہیں اسلئے آپ سے ملنے کی اچھا دل میں پیدا ہوئی ویسے جو کچھ یہ (اپنے دوست کی طرف میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا) کہتے رہتے ہیں میری عقل ان باتوں کو نہیں مانتی۔ پنڈت جی مسکرائے۔ اور بولے اس برہمانڈ کی ہر بات تو آپکی عقل میں نہیں آسکتی۔ آپ رات کو ساڑھے آٹھ بجے برلا گھاٹ پر درشن دیں۔ میں وہاں پوجا میں بیٹھوں گا شاید آپکو دیوی سدھی کا یقین ہو جائے۔

پنڈت جی کی گفتگو بناوٹ سے مبرا تھی میرے دل میں اُن کی باتوں کا اچھا اثر پڑا اسلئے رات کو میں وقت مقررہ پر اپنے ساتھی شری ورما کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

پنڈت جی نے اشنان کیا اور اسکے بعد ایک دھوتی لیکر آدھی باندھ لی اور آدھی اپنی گردن اور کمر کے گرد لپیٹ لی۔ دھوپ جلائی اور کچھ مُنہ میں پڑھنے لگے چار پانچ منٹوں کے بعد اُن کا سر زور زور سے ہلنا شروع ہو گیا اور اُن کے خاص چیلے نے جے ماتا کے نعرے لگائے یکایک پنڈت جی نے میری طرف مخاطب ہوکر کہا۔ اب بولو کیا اِچھا (خواہش) ہے؟ میرا جواب تھا اِچھائیں (خواہشات) تو بہت ہیں پرنتو پہلے میں اپنی بیماری اور مالی پریشانی کو دُور کرنیکا ڈھنگ جاننا چاہتا ہوں۔ جواب ملا پہلے پوری طرح اپنی تسلی کر لو۔ پھر تمہیں کوئی ایسا سادھن بتایا جائیگا جس سے تم دیش اور جاتی کی بڑی سیوا کرسکو گے۔ میں تمہاری سب اِچھاؤں کو جانتی ہوں۔ دھیان رہے کہ جب پنڈت جی پر دیوی کا آویش ہوتا تھا تو وہ زنانہ ڈھنگ سے باتیں کرتے تھے۔ مثلاً میں کہتی ہوں میں ایسا کرونگی وغیرہ وغیرہ۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے خاص چیلا یعنی میرا دوست پنڈت جگدیشور بول اٹھا۔ ماہیشوری یہ بہت دھرماتما اور اصول پرست سجن ہیں۔ انکی اوشیہ سہائتا کریں۔ اور ان کے کشٹوں کو دُور کریں۔ یہ کہہ کر اُس نے پنڈت جی کے چرنوں پر سر رکھ دیا۔ پنڈت جی نے پیار سے اسکے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ میں خوش دل کے دل کا حال جانتی ہوں۔ یہ بہت سچا اِنسان ہے اور بہت نیک ہے لیکن اسے مجھ پر اور میری شکتی پر

وشواس نہیں اسلئے پہلے اُسے وشواس دلاؤنگی پھر اسکی منو کامنائیں سدھ کروں گی۔ میرے دوست نے میری طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔ پنڈت جی اگر آپکی بیماری اور مفلسی دُور ہو جائے تو آپ کو ماتیشوری پر پورا وشواس آجائیگا ۔ میں نے کہا کہ میں اپنے علاوہ اپنے ایک دوست کی بیماری کے لئے بھی دوا یا دُعا چاہتا ہوں۔ میرے دوست کو بلڈ پریشر اور دل کی بیماری ہے اگر اسکی بیماری ٹھیک ہو جائے اور میں بھی پوری طرح تندرست ہو جاؤں نیز مجھے روٹی کپڑے کی ضروریات کے لئے جو مشکلات پیش آتی رہتی ہیں اُن کا خاتمہ ہو جائے تو بلا شبہ میری سَو فیصدی تسلی ہو جائے گی۔ پنڈت جی نے کہا ایسا ہی ہو گا کل رات ۹ بجے گنگا پلیٹ فارم پر پیش ہونا۔ لاؤ ہماری بھینٹ ؟ میں نے پھولوں کا ایک ہار پنڈت جی کو پیش کیا جو اسی مقصد سے بنا کر لے گیا تھا۔

پنڈت جی نے وہ ہار لیکر اس پر اپنی دھوتی کا پلّہ ڈالا۔ پھر ایک منٹ تک اپنی آنکھیں بند کر کے پرارتھنا کرتے رہے۔ اسکے بعد دھوتی جھٹک دی۔ ہار غائب تھا۔ میں اور میرا ساتھی حیران رہ گئے۔

اب پنڈت جی اپنی اصلی حالت میں واپس آچکے تھے۔ اسلئے انہوں نے اب پھر مردانہ ڈھنگ سے بات چیت کرنی شروع کر دی تھی۔ میں نے اُن کی بات چیت سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ سِدھی کی حالت میں کہی ہوئی باتیں انکیں کہاں تک یاد ہیں لیکن اپنے اس مقصد میں مجھے کامیابی نہ ہوئی میں اس امر کا فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ ڈھونگ ہے یا حقیقت لیکن ہار کے غائب ہونیکا راز میرے لئے معمہ بن گیا۔ کیونکہ پنڈت جی کے جسم پر سوائے دھوتی کے اور دوسرا کپڑا نہ تھا۔

اگلے دِن ہم رات کو نو بجے گنگا جی کے پلیٹ فارم پر پہنچے۔ چونکہ سردیوں کا موسم تھا اسلئے گھاٹ پر دو تین سادھوؤں کے علاوہ اور کوئی شخص نہ تھا۔ پنڈت جی اور ان کے دو خاص چیلے بھی آگئے۔ اور پُل جہاں مہامنا مالوی جی کی مورتی ہے کے نزدیک ایک جگہ پر استھان کر کے بیٹھ گئے کل کی طرح دھوپ جلانے کے بعد پنڈت جی نے سر ہلانا شروع کر دیا۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا خاص چیلا

بولا۔ ماتیشوری کل آپنے پنڈت جی (وہ مجھے میرے نام سے پکارنے کی بجائے پنڈت جی ہی کہا کرتا تھا) کا ہار سویکار کر لیا تھا۔ آج اپنے ہون کا ایک ہار ان کو پرشاد کے طور پر دینے کی کرپا کریں جواب ملا ابھی ایسا نہیں ہو سکتا پہلے اُن کی بیماری دُور کروں گی۔ پھر ان کے دوست کا روگ جڑ سے مٹا دونگی اسکے بعد ان کو پرشاد کا ہار دونگی اب میری باری تھی میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"تو مجھے دوا کب ملے گی۔" وہ بولیں:- اب نہیں اب میں پریاگ کے کمبھ پر جا رہی ہوں وہاں سے واپس آؤں گی تب تمہارا علاج کروں گی۔ میں نے پوچھا۔ "مجھے کتنے دن دوا کھانی پڑے گی؟"

"صرف تین دن" پنڈت جی بولے۔

میں نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔ "کیا دیوی جی دہرہ دون پدھارنے کی کرپا کریں گی؟"

"تمہاری یہی اچھا ہے تو اوشیہ آؤں گی کمبھ سے واپسی پر ہمارا خاص چیلا تمہیں سوچنا دیگا تب تم ہردوار آجانا۔ اور میں تمہارے ساتھ دہرہ دون چلوں گی۔"

"دھنیہ باد" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اسکے بعد پنڈت جی سے اجازت لیکر ہم اپنے نواس استھان پر چلے گئے۔ اور اگلے دن یعنی ۱۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو دہرہ دون واپس پہنچ گئے۔

۱۷ فروری ۱۹۵۴ء کو بذریعہ تار مجھے اطلاع ملی کہ پنڈت جی یعنی وہ سدھ پرش ہردوار پہنچ گئے ہیں۔ اگلے دن میں اپنے مرحوم دوست ماسٹر کیشو چندر چیرمین سٹی بورڈ دہرہ دون کے ساتھ ہردوار پہنچ گیا۔ ماسٹر جی کا نوکر (سُریش) بھی ہمارے ساتھ تھا۔ پنڈت جی سے ملے تو انہوں نے بتایا۔ ماتا ہون میں بیٹھی ہے اسلئے کل رات کو وقت ملے گا۔ چنانچہ ہم اگلے دن یعنی ۱۹ فروری کی رات کو ۹ بجے شرون ناتھ گھاٹ پر پہونچے پنڈت جی پہلے کی مانند پوجا میں بیٹھے ہم ایک بہت بڑا ہار ماتا کو پیش کرنے کے لیئے لے گئے تھے ماتا نے حکم دیا کہ اس ہار کے دو بنا لو۔ اور دونوں ایک ایک ہار رات کو سوتے وقت اپنے سرہانے رکھ لو۔ ماسٹر جی کی بیماری کے متعلق دیوی جی نے بتایا اگرچہ

اُن کی بیماری بہت پرانی اور خطرناک ہے لیکن مَیں اُسے دُور کر دوں گی۔ دوا تم دونوں کو... ملے گی
وہ پروگرام ختم ہو گیا اور اگلے دِن صبح ۱۱ بجے کا وقت ہمیں دیا گیا۔ ہم دونوں (مَیں اور ماسٹر کیشو چند)
واپس ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے کیونکہ ہم ریٹائرنگ روم میں ٹھہرے ہوئے تھے حسب ہدایت اپنا
ہار سرہانے رکھ کر ہم سو گئے۔

اُس رات کو خوب بارش ہوئی۔ صبح تک یہی حال رہا۔ پنڈت جی کے سیوک یعنی خاص چیلا
(پنڈت جگدیشور) آئے اور کہنے لگے آپ کمرے کا ایک حصہ خوب دھو کر صاف کروا لیں۔ مَیں پنڈت جی کو
یہیں لیکر آ رہا ہوں چنانچہ ماسٹر جی کے مُلازم سُریش نے کمرے کا ایک کونہ اچھی طرح دھو کر صاف
کر دیا۔ پنڈت جی آئے۔ نہا دھو کر اُنہوں نے ایک نئی دھوتی پہنی۔ اور آسن پر بیٹھ گئے چند منٹ کے
بعد اُن کا سر ہلنا شروع ہو گیا جو اس امر کی علامت تھی کہ دیوی کا پرویش اُن میں ہو چکا ہے میرے
دوست کیشو چندر سے دیوی نے کہا۔ تمہیں دوا دہرہ دُون جا کر دوں گی۔ آج خوشدل کو ملیگی
چنانچہ مجھے ایک کٹوری پیش کرنیکا حکم دیا۔ مَیں نے سُریش کی طرف دیکھا وہ کل شام کو خریدی ہوئی
پتھر کی کٹوریوں میں سے ایک کٹوری اُٹھا لایا جسمیں تقریباً ایک پاؤ چیز آ سکتی تھی۔ دیوی جی نے پوچھا
پہلے دوا کھانا چاہتے ہو یا دودھ پینا چاہتے ہو؟ مَیں نے عرض کی مجھے دُودھ پلایا جائے۔

پنڈت جی نے کٹوری اپنے ہاتھ میں لیکر اُسے اپنی دھوتی کے ایک سرے سے ڈھانپ دیا۔
ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں دھوتی کو پرے کر کے اُنہوں نے کٹوری میری طرف کو بڑھائی۔ ہم دونوں
حیران رہ گئے۔ کٹوری دودھ سے لبالب بھری تھی مَیں نے پوچھا اگر حکم ہو تو آدھا دودھ اپنے دوست
کو پلا دوں۔ جواب ملا۔ "بے شک پلا دو" چنانچہ مَیں نے دوسری کٹوری منگائی اور اُس میں
آدھا دودھ ڈالکر ماسٹر جی کو دیا۔ ہم دونوں نے اُسے پیا تو بہت لذت آئی۔ بالکل تازہ
گلئے کا دودھ تھا۔ ہم دونوں یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ دودھ کہاں سے آیا؟ دیوی نے دوائی

کے لئے دوبارہ پوچھا تو مَیں نے کہا کہ میری دوا بھی دہرہ دون میں ہی دی جائے۔ بولی بہت اچھا
وہ پروگرام ختم ہوا تو یہ طے پایا کہ پنڈت جی دو تین دنوں کے بعد دہرہ دون پہنچ جائیں گے چنانچہ مَیں
اور ماسٹر جی اُسی شام واپس دہرہ دون آگئے راستہ بھر ہم پنڈت جی کی سِدھی کے متعلق
بات چیت کرتے رہے اور ہم دونوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ اُس شخص کو ضرور کوئی سِدھی حاصل ہے۔

دو تین دنوں کے بعد یہ سِدھ پُرش دہرہ دون آئے اور اپنے سیوک یا خاص چیلے پنڈت
جگدیشور کے مکان واقع ریسٹ کیمپ میں ٹھہرے مَیں اُن سے ملا اور ان سے اپنے دوست ماسٹر
کیشو چند کے مکان پر چل کر دیوی کا آواہن کرنے کے لئے کہا تو وہ مان گئے۔ چنانچہ اگلی صبح کا پروگرام
بنایا گیا۔ مَیں نے نہ صرف ماسٹر جی (شری کیشو چندر) کو پروگرام سے مطلع کیا بلکہ پانچ سات اور اشخاص
کو بھی اطلاع کر دی۔ وقت مقررہ پر سِدھ پُرش آئے اور حسبِ سابق اشنان کر کے ایک دھوتی اپنے
جسم پر لپیٹ اور پوجا میں بیٹھ گئے۔ چند منٹوں کے بعد دیوی کا پردیش ہو گیا۔ بولے "خوش دل"۔
آج تمہیں اور تمہارے دوست کو دوا دی جائے گی۔ اگر دوا سے پہلے دودھ پینا چاہتے ہو تو بتاؤ
مَیں نے عرض کیا کہ ضرور دُودھ پینا چاہتا ہوں چنانچہ مَیں نے ایک خالی کٹوری پیش کر دی ایک منٹ
کے بعد ہی دودھ سے بھری کٹوری پنڈت جی نے مجھے واپس کر دی۔ مَیں نے دُودھ پیا تو بہت لذیذ تھا
لیکن پھیکا۔ مَیں نے کہا کہ میرے دوست کو بھی دُودھ پلایا جائے۔ حکم ہوا۔ اور کٹوری دو چنانچہ
دوسری کٹوری دی جو بھری ہوئی واپس کر دی گئی۔ ماسٹر جی جب دودھ پی چکے تو مَیں نے کہا۔ ماتیشوری
دودھ پھیکا تھا اسلئے کوئی میٹھی چیز پینے کو جی چاہتا ہے۔ بولی لاؤ۔ دوسرا برتن۔ کون سی میٹھی
چیز چاہتے ہو؟ میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ شربت رُوح افزا۔ دوسرے منٹ دو
کٹوریاں شربت رُوح افزا کی بھری ہوئی ہمارے سامنے تھیں۔ ایک مَیں نے پی اور دوسری ماسٹر جی
نے۔ اب مَیں نے دوا کے لئے درخواست کی۔ چنانچہ پہلے مجھے اور اُس کے بعد ماسٹر جی کو دوا دے دی گئی۔

دونوں دوائیں ایکدوسرے سے مختلف تھیں۔ سدھ پُرش کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی۔ کوئی تھیلا وغیرہ ان کے پاس نہیں جن میں سے یہ چیزیں نکالکر دے سکیں۔ خالی کٹوری لیکر اُسے ایک ہاتھ میں رکھ کر اور دھوتی کے پلّے سے ڈھانپ کر دوسرا ہاتھ اسکے اوپر رکھ کر منھ میں کچھ پڑھتے ہیں۔ اور ایک منٹ کے بعد وہ کٹوری واپس کر دیتے ہیں۔ جو دودھ یا دیگر کسی چیز سے بھری ہوتی ہے اسی طرح دوائیں بھی نہیں دیں۔ دوا دینے کے بعد اس دن کا پروگرام ختم ہوا۔ اب رات کو دوائی دینے کے لئے کہا۔

پنڈت جی۔ جب اپنے سیوک یعنی خاص چیلے کے ساتھ چلے گئے۔ تو مَیں نے وید سُریش چندر (جو بہت چالاک اور ہوشیار شخص تھا۔) سے پوچھا کہئے کیا رائے ہے آپ کی۔ یہ سب کیا ہے؟ وید جی بولے خوشدل صاحب! عقل دنگ ہے۔ مَیں نے اس سدھ پُرش کی ایک ایک حرکت پر کڑی نگاہ رکھی ہے۔ لیکن کہیں کچھ دھوکا اور فریب مِل سکا۔ ضرور اسکے پاس کوئی سدھی ہے۔ مَیں نے دو جیوتشیوں سے دریافت کیا۔ انکی بھی رائے یہی تھی ان کے علاوہ اور جو اشخاص وہاں موجود تھے۔ اُنہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ یہ صحیح معنوں میں سدھ پُرش ہیں اور ان کے پاس دیوی کی سدھی ہے رات کو بھی صبح والا پروگرام دوہرایا گیا۔ اور اگلے دن بھی۔

مجھے اپنی بیماری اور دیگر دُنیاوی پریشانیوں کا خاتمہ قریب دکھائی دیا۔ دِل کو بہت خوشی ہوئی۔ کہ آئندہ زندگی کچھ سکون سے بسر ہو گی لیکن افسوس یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نہ تو میری بیماری ہی دُور ہوئی اور نہ ہی مالی پریشانی۔ میرے دوست ماسٹر کیشو چندر کو بھی دوا سے کچھ فائدہ نہ ہوا اور یہ حقیقت ہے کہ ماسٹر جی کی موت کا کارن وہی دِل کی بیماری تھی۔

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سدھ پُرش کے پاس کوئی سدھی ضرور ہے یہ بات دیگر ہے کہ وہ اس سدھی سے خود کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ اور نہ کسی دیگر شخص کا بھلا کر سکیں۔

کچھ نہیں ہوتا

یہ مت سمجھو خدا کی بندگی سے کچھ نہیں ہوتا
خدا سے دُور رہ کر آدمی سے کچھ نہیں ہوتا
بھروسہ ہے جب بھگوان کا اُس نیک بندے کو
کسی کی دوستی و دشمنی سے کچھ نہیں ہوتا
وہ بخشا جائے گا توبہ کرے گا صدقِ دل سے جو
دکھاوے کی فقط شرمندگی سے کچھ نہیں ہوتا
مصیبت دُور کرنے کے جتن لاکھوں کئے جاؤ
خدا راضی نہ ہو جب تک، کسی سے کچھ نہیں ہوتا
دلی راحت ملے گی نیکی اور نِشکام سیوا سے
امیری سے فقیری سے خودی سے کچھ نہیں ہوتا
ہمیشہ شاعروں نے سوتی قوموں کو جگایا ہے
غلط ہے یہ کہے جو شاعری سے کچھ نہیں ہوتا
ہر اک عالم میں خوش رہنے کی عادت ڈال لو خوشدلؔ
یہی ہے زندگی - مُردہ دلی سے کچھ نہیں ہوتا

موت کا

ایک دن

معیّن ہے

موت کا ایک دِن معیّن ہے

مَیں اُن سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کے نظریئے سے بالکل اتفاق نہیں کرتا جو یہ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کو آرام اور ادویات یا دیگر طریقوں سے لمبا کیا جا سکتا ہے۔ مَیں تو دِل کی گہرائیوں سے یہ مانتا ہوں کہ ہر جاندار ہستی کی موت کا ایکدن معیّن ہے اسی لئے مَیں دنیاوی پریشانیوں اور خطرناک بیماریوں کے حملوں کے باوجود ہمیشہ خوش و خرم رہتا ہوں۔

میرے اس خیال (موت کا ایکدن معیّن ہے) کو یقین کی صورت میں تبدیل کرنیکا باعث میری اپنی زندگی کے کئی حیران کن اور نا قابلِ فراموش واقعات ہیں یہ واقعات کئی سال پیشتر کے ہیں۔ گذشتہ دس سالوں سے مَیں جن خطرناک امراض (دِل کی بیماری۔ جگر کی خرابی۔ کو آپر پراسٹیٹ گلینڈ (PROSTATE GLAND) کا بڑھنا۔ لو بلڈ پریشیر (LOW BLOOD PRESSER) اور پرانی پیچش (CHRONIC DYSENTRY) کا شکار ہوں۔ ان بیماریوں کے باعث ڈیڑھ درجن کے قریب میرے واقف کار جن میں زیادہ تعداد دہرہ دون نواسیوں کی تھی) موت کی تاریکیوں میں گم ہو چکے ہیں یہ وہ اصحاب تھے کہ جن کے پاس کافی دولت تھی۔ اور جن کو بہترین طبّی امداد۔ عمدہ خوراک کے علاوہ مکمل آرام حاصل تھا ان کے مقابلے میں مجھے صرف ایک دو ہمدرد اور مہربان ڈاکٹروں کی طبّی امداد اور ناقص و گھٹیا خوراک ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ہمت سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی مَیں ابھی تک زندہ ہوں اور تب تک زندہ رہونگا جب تک میری موت کا مقررہ دِن نہیں آجاتا۔

موت میرے لئے اب کوئی ڈراونی چیز نہیں رہی لیکن اس کے باوجود زندہ رہنے اور نیک نام حاصل کرنے کی خواہش میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے میں اپنے دیشواسیوں کی ٹھوس بھلائی کا کوئی کام کر جاؤں۔ لیکن میری دلی خواہش کب پوری ہوتی ہے اسکے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ اسکے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں تو ایک سادھارن انسان ہوں میں نے ایسے ایسے مشہور اشخاص کو اچانک موت کا شکار ہوتے دیکھا ہے جن کی بابت بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اُن کو پرماتما کے درشن ہو چکے ہیں اور وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر مجھے کسی شاعر کا ایک شعر یاد آ جاتا ہے جو یہ ہے ؎

موت نے کر دیا لاچار و گرنہ انسان
یہ وہ خود بیں ہے۔ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

چونکہ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ چند نیک دل اور روشن ضمیر اصحاب کو اپنی موت کے وقت کا پہلے ہی علم ہو گیا اور انہوں نے یہ بات اپنے رشتہ داروں یا ساتھیوں کو بتا دی۔ لیکن ایسے اشخاص کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جنہوں نے اپنی مرتیو کی پیشین گوئی کر دی تھی اور مقررہ وقت پر ہنسی خوشی موت سے بغلگیر ہو گئے۔ باقی تمام انسان لاعلمی میں اچانک موت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی میں موت کا سامنا کرنے کے لئے کوئی تیاری نہیں کرتے۔

بھنور سے ہی گذر کر سب پہنچتے ہیں کناروں پر
جہاں طوفاں نہیں ہوتے وہاں ساحل نہیں ہوتے
سمجھ سکتے نہیں وہ زندگی کے لطف و راحت کو
کہ جن کی زندگی میں حادثے نازل نہیں ہوتے

ہیضے کا حملہ

سنہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ مَیں نے کھڑکھڑی ہردوار میں مثان گھاٹ کے پاس پنڈت بیکھارام کی کوٹھی میں ایک کمرہ رہائش کے لئے لے رکھا تھا اور گئو گھاٹ (جہاں پھول بیچنے والے بیٹھتے ہیں اور جہاں اب ایک پختہ پُل بن چکا ہے) پر ایک بڑا حال کمرہ کرایہ پر لیکر اور دو جیوتشیوں (ان میں سے ایک تو بنگالی مہاتما تھے جن کو لوگ اتریامی کہتے تھے اور دوسرے جیوتشی تھے شری گیان پرکاش جو کسی وقت مہاراجہ اندور کے پاس رہتے تھے) کو ساتھ ملاکر ایک جیوتش کاریالہ کھول رکھا تھا۔ اب اس ہال کرے کے دو تین چھوٹے چھوٹے حصّے بنا دیئے گئے ہیں اور ایک حصّے میں آج سہگل فوٹو ہاؤس ہے۔ بنگالی مہاتما سنسکرت کا بڑا وِدوان تھا۔ اور نہ صرف موک پرشن یعنی من میں سوچا ہوا سوال بتانے میں ماہر تھا بلکہ تسٹ تیرریکا یعنی چہرہ دیکھ کر جنم کنڈلی بھی بنا لیتا تھا۔ پنڈت گیان پرکاش سندھی تھا اور ایک اچھا جیوتشی ہونیکے علاوہ بہت چرب زبان اور زمانہ ساز تھا چنانچہ کام کافی چل نکلا۔ میرے دن خوب مزے سے بسر ہونے لگے۔ ایک نوجوان بابو رام شرما اُن دنوں میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہ نوجوان دو تین سال پہلے مجھے لاہور چھاؤنی میں ملا تھا اور ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا مَیں نے اُسے اُس چکر سے نکالا اور جیل جانے سے بچایا۔ جب سے یہ میرے ساتھ ہی رہنے لگا۔ آجکل وہ کرت پور کے نزدیک اپنے گاؤں سمبھوتہ میں رہتا ہے اور ڈاکٹر بنا ہوا ہے دہرہ دون میں وہ تین چار بار آکر مجھے مِل چکا ہے اور اپنی دو تین دوائیاں پٹینٹ کروانے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے اس نوجوان کا مفصل حال کسی دوسری جگہ درج ہے۔ بابو رام بھاردواج میری ہدایات کے مطابق جیوتش کاریالیہ کا کام چلاتا تھا۔ اور مَیں اکثر سیر سپاٹے میں مصروف رہتا تھا۔ مَیں نے اُس کاریالہ کے باہر بورڈ لگوا

رکھا تھا کہ اپنا ایک سوال مُفت پوچھیں۔ اگر آپ کی تسلی ہو جائے تو اپنے مستقبل کے حالات فیس دے کر
دریافت کریں۔ دونوں جیوتشیوں کے اخراجات نکال کر مجھے اپنے اور بابورام کے خرچ کے لئے کافی
پیسے مل جاتے تھے۔

بنگالی مہاتما نے پہلی ملاقات ہی میں بتادیا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ تک میرے پاس نہیں
ٹھہرے گا۔ کیونکہ وہ اُتر کاشی جانا چاہتا تھا چنانچہ ڈیڑھ ماہ میرے پاس رہنے کے بعد بنگالی
مہاتما اُتر کاشی چلا گیا۔ اور اب جیوتش کا کام صرف گیان پرکاش سندھی کے ذریعہ چلنے لگا۔ کچھ عرصہ کے
بعد مجھے معلوم ہوا کہ اُس سندھی جیوتشی کا چال چلن اچھا نہیں۔ چنانچہ میں نے اُسے علیحدہ کرنیکا پکا فیصلہ
کر لیا اور اس سلسلے میں ایک ہفتے کا زبانی نوٹس بھی دے دیا۔ میرا ارادہ جیوتش کاریالیہ کو بند کر کے
رشی کیش میں جا کر کچھ عرصہ رہنے کا تھا کہ میں ایکدن ہیضے کا شکار ہو گیا۔ رات کو میرے پیٹ میں درد
شروع ہوا اور صبح ہونے تک دس بارہ دست ہو گئے۔ جسم میں ایکدم کمزوری آگئی لیکن میں نے
پھر بھی ہمت سے کام لیا اور روزمرّہ کی مانند اپنے رہائشی کمرے سے گئوگھاٹ (جیوتش کاریالیہ) کی جانب
چل پڑا۔ بابورام میرے ساتھ تھا۔ راستہ میں مجھے دو تین مریض نظر پڑے جس سے طبیعت اور بھی گھبرا گئی۔
ان دنوں گرمیوں کے دنوں میں ہیضہ بہت پھیلا کرتا تھا اور روزانہ دو تین درجن اشخاص ہیضے
کے باعث مر جاتے تھے۔ ہیضے کے تمام مریضوں کو ہسپتال پہنچایا جاتا تھا اور وہاں سے کوئی
خوش قسمت ہی زندہ بچکر آتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ ہسپتال کسی صورت
میں نہ جاؤں گا۔ اگر مرض مزید بڑھ گیا اور حالت زیادہ خراب ہو گئی تو ہردوار کی حدود سے باہر
چلا جاؤں گا۔ ایک ویدجی میرے واقف تھے میں اُن کے پاس پہنچا اور اپنی حالت بیان کی۔ اُنہوں
نے ہسپتال میں بھرتی ہونیکا مشورہ دیا جسے میں نے ٹھکرا دیا اور اپنے ارادے سے اُنھیں مطلع کر دیا
کہ ہسپتال ہرگز نہ جاؤں گا۔ اُنہوں نے دوا تو دیدی لیکن جونہی میں اُن کی دوکان سے رخصت ہوا
اور گئوگھاٹ اپنے جیوتش کاریالیہ میں پہنچا اُنہوں نے میڈیکل افسر کو میری بیماری کی اطلاع
دیدی۔ میڈیکل افسر نے سیوا سمتی والوں سے کہا اور تین چار والنٹیر سٹریچر لے کر مجھے ہسپتال

لے جانے کے لئے آگئے ۔ مَیں سخت گھبرایا اور اُن والنٹیروں سے بہتیرا کہا کہ مَیں ہسپتال نہیں جانا چاہتا لیکن وہ نہیں مانے اُن میں سے ایک تو نہایت تیز طرار اور مُنہ پھٹ تھا وہ کہنے لگا کہ ہم آپکو زبردستی ہسپتال لے جائیں گے کیونکہ یہاں کی کمیٹی کا قاعدہ یہی ہے ۔ ہردوار میں ہیضے اور چیچک کے تمام مریضوں کو چھُوت کے ہسپتال میں بھرتی ہونا پڑتا ہے اسلئے آپ بھی خود اُتیار ہو جائیں ۔ مَیں نے جب دیکھا کہ یہ دونوں سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں ، اور یہ ضرور مجھے ہسپتال لے جائیں گے تو من ہی من میں ان سے رہائی پانے کی ترکیبیں سوچنے لگا اتنے میں مجھے پاخانے کی پھر حاجت ہوئی مَیں نے بابو رام کو سمجھایا کہ وہ میرے کپڑے گھر سے لانے کے بہانے یہاں سے جائے اور بازار میں میرا انتظار کرے ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جس بلڈنگ میں مَیں نے جیوتش کاریالیہ کھول رکھا تھا اُس کو ٹھے سے پھلانگ کر بازار میں جایا جا سکتا تھا ۔

مَیں نے یہی اسکیم بنائی کہ مَیں پاخانے سے فارغ ہوتے ہی دیوار پھلانگ کر بازار میں پہنچ جاؤں گا ۔ اور بابو رام کو ساتھ لیکر ہردوار سے باہر نکل جاؤں گا چنانچہ مَیں نے اونچی آواز میں بابو رام سے کہا "مجھے پھر ٹٹی کی حاجت ہو رہی ہے اسلئے مَیں تو اوپر کوٹھے پر پاخانے جا رہا ہوں چونکہ دستوں کے باعث میری دھوتی خراب ہو چکی ہے اسلئے تم گھر سے میرے کپڑے (دھوتی اور کُرتہ) لے آؤ"

یہ کہہ کر مَیں نے مکان کی چابی بابو رام کے ہاتھ پر رکھدی وہ مُنہ پھٹ والنٹیر بولا ۔ "بابو جی ۔ کیوں مُفت میں نیا جوڑا ضائع کرتے ہو ، یہی کپڑے پہنے رہو ، چند گھنٹوں کی تو بات ہے پھر گنگا مائی کی جے ہو جائیگی ، نیا جوڑا اس بابو جی کے کام آئیگا مجھے اسکے ریمارکس پر غصّہ تو آیا لیکن مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بھئی ہسپتال سے بچکر آنا تو ممکن ہی نہیں تو پھر کیوں نہ نئے کپڑے وہاں پہن کر جاؤں تاکہ سیوا سمتی کو میرے کفن کا بندوبست نہ کرنا پڑے ۔ بڑی مشکل سے سیوا سمتی والے اس امر پر رضامند ہوئے کہ بابو رام میرے کپڑے گھر سے لے آئے ۔ اسکے جانے کے فوراً بعد مَیں نے لوٹا اٹھایا اور پاخانے کی طرف چلا ۔ کوٹھے پر ٹٹی میں گیا تو ایک ایسا دست ہوا کہ آنکھوں کے آگے کمزوری کے باعث

اندھیرا چھا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کمزوری اسقدر محسوس ہونے لگی کہ چھ فٹ کی دیوار پھاندنا میرے لئے سخت مشکل ہو گیا۔ میں اپنی بدقسمتی کا ماتم کر رہا تھا کہ اتنے میں بلڈنگ کا جمعدار آ گیا۔ پوچھنے لگا۔ کہ کیا طبیعت زیادہ خراب ہے میں نے کہا کہ بہت زیادہ کمزوری ہو گئی ہے اور پنچ یم دوت بیٹھے ہیں وہ ہسپتال لے جائیں گے وہاں سے زندہ آنا ممکن نہیں اسلئے میں اُن کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ پنجاب کی گاڑی پر سوار ہو کر لاہور پہنچ جاؤں۔ اس سلسلے میں تم میری کچھ مدد کرو۔ وہ بولا پنڈت جی۔ جو سیوا میرے لائق ہو بتاؤ۔ میں ضرور کروں گا میں نے کہا۔ کہ ایک تو تم مجھے اس دیوار سے دوسری طرف اترنے میں مدد دو۔ دوسری طرف میرا آدمی کھڑا ہے۔ میں اسکے ساتھ پنجاب چلا جاؤں گا وہ مجھے چھوڑ کر دو تین دن تک واپس آ جائیگا دوسرے تب تک تم میرے کمرے کی دیکھ بھال کرنا اور میرے سامان کا خیال رکھنا اور کسی سے یہ نہیں کہنا کہ میں لاہور چلا گیا ہوں۔ وہ جمعدار مان گیا اور اُس نے مجھے دیوار پھلانگنے میں مدد دی۔ میں بازار میں پہنچا تو بابو رام کو اپنا منتظر پایا۔ زندگی کی آس نے جسم کی کمزوری کو تھوڑی دیر کے لئے بھلا دیا۔ اور میں بازار سے چلکر ٹانگے اڈے پر پہنچا۔ وہاں سے ہم دونوں ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی میں کچھ دیر تھی چنانچہ ہم اسٹیشن کے سامنے والی دھرم شالہ کے کوٹھے پر جا کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا کہ سیوا سمتی کے دو تین والنٹیر تیز تیز چلتے ہوئے اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ غالباً مجھے تلاش کر رہے ہوں گے لیکن میں اُن کے ہاتھ نہ لگ سکا۔ جب وہ ریلوے اسٹیشن پر مجھے نہ پا سکے تو واپس چلے گئے۔ ہم دونوں دھرم شالا سے اُتر کر گاڑی میں جا بیٹھے اور میں بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگا۔ کہ وہ ہردوار سے جلد از جلد مجھے باہر لے جائے۔ گاڑی چلی تو ایک مسافر کو اپنا حال بتایا اُس نے سہارنپور پہنچکر دوا دینے کا وعدہ کیا۔ جب گاڑی سہارنپور پہنچی تو وہ شیشے کے گلاس میں میرے لئے دوا لے آیا۔ دوا سخت کڑوی اور بدبودار تھی لیکن زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے میں وہ ساری دوا پی گیا۔ اُس دوا نے جادو کا اثر کیا۔ میری کمزوری ایکدم دور ہو گئی اور اسکے بعد مجھے دست بھی نہ آیا۔ انبالہ پہنچکر میں نے اُس مسافر سے جب دوا کا نام پوچھا

تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ پنڈت جی یہ دیوتاؤں کا امرت ہے اور اسے سوم رس کہتے ہیں دُنیا والے اسے شراب کے نام سے پکارتے ہیں۔ آپنے شاید آج تک اس کا ذائقہ نہیں چکھا تبھی آپ اسے پیتے وقت مُنہ بنا رہے تھے۔ یہ امرت ہے امرت۔ بشرطیکہ مناسب مقدار میں لیا جائے۔

واقعی مَیں نے پہلی بار شراب پی تھی لیکن اس شراب نے مجھے ہیضے کے چُنگل سے بچا لیا اور لاہور پہونچتے ہی مَیں بھلا چنگا ہو چکا تھا۔

ایک ماہ لاہور میں رہنے کے بعد جب مَیں ہردوار واپس آیا۔ تو وہی سیوا سمتی کا مُنہ پھٹ نوجوان ملا۔ کہنے لگا۔ بہت خوش قسمت ہو پنڈت جی۔ ہم نے ۵۵ بیمار اشخاص کو ہسپتال پہنچایا تھا۔ اُن میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا۔ اگر تم بھی ہسپتال پہنچ جاتے تو "گنگا مائی کی جے" بول جاتی مَیں نے ہنستے ہوئے کہا کہ تبھی تو میں تم دونوں کو چکمہ دیکر یہاں سے چلا گیا تھا کیونکہ ابھی میری زندگی باقی تھی اور میری موت کا مُقررہ دِن نہیں آیا تھا۔

شگوفے

جو زندگی پہ گھٹا بن کے چھا نہیں سکتا
کبھی وقار کی منزل وہ پا نہیں سکتا

جو اپنی موت سے پنجہ لڑا نہیں سکتا
وہ لُطف زیست کا ہرگز اُٹھا نہیں سکتا

جو خونِ دل سے شگوفے کھلا نہیں سکتا
وہ گلستاں پہ کوئی حق جما نہیں سکتا

غموں میں رہ کے بھی جو مُسکرا نہیں سکتا
وہ اپنے آپ کو خوشدل بنا نہیں سکتا

بگھیرے کا سامنا

فروری یا مارچ سنہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں سورگ آشرم، رشی کیش میں تھا
مہنت سندر پرکاش جی کے کہنے پر میں نے چھ ماہ کے لئے آشرم میں رہ کر وہاں کا انتظام ٹھیک
ڈھنگ پر چلانے کا ذمہ لے لیا تھا۔ مہنت جی نے مجھے اپنے تمام اختیارات دے رکھے تھے اور میں آشرم
کی صفائی، خوبصورتی اور ترقی کے لئے ہمہ تن مصروف تھا۔

ایک رات میں سویا تو دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ پیٹ میں درد کی
لہریں اٹھ رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے درگا دیوی کو جگایا اور اس سے پانی گرم کرنے کے لئے کہا تاکہ میں کوئی
دوا کھا لوں۔ ایک سخت قسم کا چورن گرم پانی کے ساتھ لینے کے آدھ گھنٹے کے بعد مجھے پاخانہ کی حاجت
محسوس ہوئی۔ میں نے لوٹا اٹھایا اور ٹٹی کی جانب چل دیا۔ سورگ آشرم میں رہنے والے۔ مہنت۔ ان کے
گورو بھائی اور آشرم کے تمام کرمچاری جنگل ہی میں پاخانہ وغیرہ جایا کرتے تھے۔ لیکن میں نے اپنے لئے
مکان کی پچھلی جانب ٹین کی چادروں سے ایک عارضی ٹٹی تیار کرا لی تھی۔ یہاں یہ بتانا غیر ضروری نہ ہوگا کہ
مہنت جی اپنے گورو بھائیوں اور دفتر کے کرمچاریوں کے ساتھ سورگ آشرم کے دفتر کے پاس ہی رہائش
رکھتے تھے۔ صرف میں نے اپنی رہائش کے لئے گنگا جی کے کنارے تین کمروں والا ایک مکان پسند کیا اور
جب تک سورگ آشرم میں رہا وہیں رہتا رہا۔

ہاتھ والی لالٹین کو ٹٹی کے دروازے پر رکھ کر میں رفع حاجت کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ ایکدم
ایک زوردار دہاڑ کے ساتھ ایک شیر نے ٹٹی کے اندر جھانکا۔ میرا خون رگوں میں خشک ہو گیا۔ موت
سامنے کھڑی دکھائی دی اور میں کانپ اٹھا۔ اگر وہ درندہ صرف ڈیڑھ ہاتھ آگے بڑھ کر میری ٹانگ

یا جسم کے کسی دوسرے حصے کو اپنے مُنہ میں لے لیتا تو میری موت یقینی تھی لیکن وہ خونخوار جانور
اندر جھانک کر فوراً پیچھے ہٹ گیا اور ٹٹی کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر غرانے لگا مجھے اس کے غرانے اور
تیز سانسوں کی آواز بخوبی سُنائی دے رہی تھی اور میں نے اپنے دل میں سمجھ لیا تھا کہ یہ مجھے کسی صورت
بھی نہ چھوڑے گا۔ شائد لیمپ سے ڈر کر اندر نہ آیا ہو لیکن باہر نکلتے ہی یہ مجھے کھا جائیگا۔

دو تین منٹ خوف سے میرے جسم پر لرزہ طاری رہا۔ میں نے پوری طاقت سے اپنی بیوی کو
آواز دی۔ وہ کھڑکی کے پاس آ کر بولی کیا چاہیئے۔ میں نے کہا اپنا دروازہ اچھی طرح بند کر لو اور کھڑکی
کے بالکل پاس مت کھڑی ہونا۔ ٹٹی کے باہر شیر کھڑا ہے۔ میں نے چونکہ بگھیرے کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا
اسلئے میں اسے شیر ہی سمجھ رہا تھا۔ یہ تو مجھے اگلی صبح بتایا گیا کہ وہ شیر نہیں تھا بلکہ ایک بگھیرا تھا۔
خیر میں نے اپنی بیوی کو ہدائت دی کہ وہ دوسرا لیمپ جلا لے اور میرے سرہانے سے ٹارچ اٹھا کر ٹٹی
کی طرف اسکی روشنی پھینکے۔ نہ جانے بگھیرے نے کس خطرہ کا احساس کیا۔ وہ ٹٹی سے کچھ دور چلا گیا۔ میں نے
وہیں یعنی ٹٹی میں ہی کھڑے ہو کر دیکھا کہ وہ چند گز کے فاصلے پر ایک دیوار کے سائے میں کھڑا ہے۔ اس حالت
میں باہر کیسے نکلتا۔ چنانچہ میں نے اپنی دھرم پتنی کو پھر ہدائت دی کہ وہ ساتھ والے کمرے سے دولت رام
(جو اُن دنوں میرے پاس نوکر کی حیثیت سے تھا) کو اُٹھا دے اور اسے کھڑکی کے سامنے لائے
تاکہ میں اسے مزید ہدایت دے سکوں۔ دولت رام آیا تو میں نے اسے کہا۔ تم گنگا جی کے کنارے کنارے
جاکر ملاحوں کی کٹیاؤں تک جاؤ۔ وہاں سے ایک ملاح کو مہنت جی کے پاس بھیج دو اور اُن سے کہو کہ
وہ بندوق لیکر آئیں۔ باقی سات آٹھ ملاحوں سے کہو کہ کنستر ڈھولک یا کھڑتال بجاتے ہوئے
اور شور مچاتے ہوئے یہاں تک آئیں اور اپنے ساتھ جلتی ہوئی مشعلیں ضرور لائیں۔ یہ ہدایات دیکر
میں پھر ٹٹی کے اندر بیٹھ گیا۔ دس بارہ منٹوں کے بعد میرے کانوں میں کنستر بجنے اور شور و غل کی
آوازیں آنے لگیں۔ وہ آوازیں جوں جوں میرے قریب ہوتی گئیں توں توں میری جان میں جان
آتی گئی۔ جب تک وہ لوگ میری ٹٹی کے قریب پہنچے۔ بگھیرے صاحب غائب ہو چکے تھے۔ میں باہر آیا
اور من ہی من میں لرزہ خیز موت کے چنگل سے بچ نکلنے پر بھگوان کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ دیر بعد سب ملاحوں کو رخصت کردیا اور اپنے دروازے بند کرکے چارپائی پر لیٹ گیا لیمپ بجھا دیا گیا اور میری دھرم پتنی بھی اپنی چارپائی پر دراز ہوگئی۔ مجھے سوئے ہوئے مشکل سے ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ایک گرج دار آواز سے میری آنکھ کھل گئی "مارچ جلائی تو کھڑکی سے باہر کھڑا بگھیلا پھر غرا رہا تھا۔ اب میں نے صاف صاف دیکھا کہ وہ بہت بھینچی کی حالت میں کھڑکی کے آس پاس چکر کاٹ رہا ہے اور زور زور سے غرا رہا ہے۔ میں نے بیوی کو پھر جگایا اور ہم دونوں کھڑکی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ جب دوبارہ اس نے کھڑکی کے پاس اپنا منھ لاکر دھاڑ ماری تو میرے منھ سے بے ساختہ نکل گیا " بھلے مانس میری موت تیرے ہاتھ میں نہیں ہے ورنہ تو مجھے کب چھوڑتا اور ابھی مجھے مرنا نہیں۔ اسلئے جا کسی اور جگہ اپنی خوراک تلاش کر"۔ یہ میرے اس وقت کے دلی خیالات تھے جو خود بخود زبان پر آگئے۔

کچھ دیر بعد بگھیرے کی دہاڑ یا غراہٹ بند ہوگئی اور ہم نے سمجھ لیا کہ وہ بھاگ گیا ہے کیونکہ صبح ہونیوالی تھی ...... باہر کافی اُجالا ہو رہا تھا ہم نے لیمپ بجھایا اور سو گئے۔ صبح جب میں دفتر کی طرف گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سادھو کی بکری کا بچہ اُٹھا کر لے گیا ہے۔ مہنت جی سے ملا۔ بول اُٹھے اس سالے (مُراد بگھیرے سے تھی) کو یہ نہیں پتہ کہ خوشدل ہمارا مہمان ہے آج تو اُسے میں نے چھوڑ دیا ہے اگر پھر کبھی آیا تو گولی سے اُڑا دوں گا۔" میں نے مہنت جی سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور دونوں دفتر کی جانب چل دیئے۔

نورِ حق کو دیکھنے والوں سے کہنا ہے مجھے
لَو چراغِ زر پرستی کی تو مدّھم کیجئے
بہتری انسان کی ہے کھنگوان کے ہر کام میں
اس عقیدے کو ہمیشہ دل میں محکم کیجئے

تانگے اور ٹرک کی ٹکر

جولائی ۱۹۴۵ء میں میں نے رام ناٹک کلب ماڈل ٹاؤن لاہور کے لئے۔ رامائن کو ڈرامے کی صورت میں لکھنے کا ذمّہ لیا اور اس کام کے لئے تین سو روپیہ اس کلب نے مجھے دینا منظور کیا چنانچہ ایکبار پھر (اس سے پہلے بھی کئی بار کئی ماہ تک میں وہاں رہ چکا تھا) میں نے اپنے بیوی بچوں سمیت ماڈل ٹاؤن میں ڈیرا لگایا۔

معاہدہ کے مطابق ڈیڑھ سو روپیہ (۱۵۰/-) مجھے پیشگی نے دیئے گئے باقی روپیہ ڈراما مکمّل ہونے پر ملنا تھا۔ روپیہ۔ پیسہ کے بارے میں میں جوانی ہی سے لاپرواہوں۔ اور اس سلسلے میں کبھی کبھی فضول خرچی کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہوں۔ جو آیا۔ کھاپی لیا کل کا بھگوان مالک۔ یہ حالت ابھی تک قائم ہے بڑھاپے اور بیماری کے باعث پہلے جیسی مستی اور شاہ خرچی تو نہیں رہی لیکن اب بھی عادت وہی ہے جو پہلے تھی میرا ذیل کا شعر اس سلسلے میں میرے سوبھاؤ پر روشنی ڈالتا ہے۔ ؎

ہمیشہ زر کو میں نے خاک سے بھی ہیچ سمجھا ہے
یہ نادانی تو ہے لیکن یہ نادانی نہیں جاتی

چنانچہ جو ڈیڑھ سو روپے مجھے ملے وہ دو ہفتوں ہی میں ختم ہو گئے۔ اور میں صبح و شام پرانے دوستوں اور واقف کاروں کی محفل میں لطف اندوز ہوتا رہا اور ڈرامے کی طرف قطعاً توجہ نہ دے سکا جب معاہدہ کے مطابق ڈرامہ مکمّل کرنے کی تاریخ میں دس بارہ روز رہ گئے تب مجھے فکر ہوئی۔ کلب کے سکرٹری سے ایک صد روپیہ لیا۔ اور اپنی دونوں بیویوں کو ان کے گھروں میں بھیجکر میں نے ایک ہفتہ کیلئے نیل کنٹھ (سورگ آشرم رشی کیش سے آٹھ نو میل اوپر ایک پرفضا مقام) جانے کا پروگرام بنایا تاکہ وہاں ایکانت

میں بیٹھ کر راماٸن مکمل کر سکوں۔ جس رات کو مجھے لاہور گاڑی پر سوار ہونا تھا اُسی شام کو میں ایک ٹانگے پر لاہور چھاؤنی اپنے والدین سے ملنے جا رہا تھا۔ کہ بڑی نہر کے پُل کے پاس ایک لرزہ خیز حادثہ پیش آیا۔ میں تانگہ میں اکیلا ہی تھا۔ اور بڑے مزے سے سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا کہ اچانک ملٹری کے ایک ٹرک سے تانگے کی ٹکر ہوگئی۔ کوچوان اُچھل کر کافی دُور جا گرا۔ اور میں ٹانگے کے نیچے دب گیا۔ کچھ لمحوں کیلئے تو میں بیہوش رہا لیکن جوں ہی مجھے ہوش آیا تو میں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا "ارے بھائی لاش کو نیچے سے نکالو۔ شائد بیچارے میں کچھ دم باقی ہو اور کوشش کرنے سے اُسکی جان بچ جائے۔"

میں نے اپنے ارد گرد دیکھا تانگہ ٹوٹ چکا تھا اور سڑک میں دھنسا ہوا تھا۔ گھوڑا سخت زخمی ہو چکا تھا۔ اور میں ٹرک کے پہیوں کے پاس پڑا تھا۔ لوگوں نے تانگہ سڑک کے نیچے سے نکالا اور مجھے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ میری عینک ٹوٹ چکی تھی اور میرے ہاتھوں پر بھی چند خراشیں آئی تھیں لیکن کوئی سخت چوٹ مجھے نہ لگی تھی۔ ٹرک میں ملٹری کے چند گورے تھے۔ اُنہوں نے مجھے ملٹری اسپتال میں پہنچانے کی پیشکش کی لیکن میں نے اسکی کوئی ضرورت نہ سمجھی اور ایک دوسرے ٹانگے میں سوار ہو کر گھر پہنچ گیا۔

اُس حادثہ سے زندہ بچ نکلنا واقعی قدرت کا ایک معجزہ تھا اور اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے کہ وقت سے پیشتر موت نہیں آتی۔

سمجھو وہی ہیں مردِ خدا اس جہان میں
آغوشِ موت میں جو بے خوف و خطر گئے
جس دن غموں کے درد سے ہم کھُل کے رو دیئے
دُنیا کہے گی حضرتِ خوشدل بھی مر گئے

کشتی کا حادثہ

یہ واقعہ ۱۹۴۶ء کی سردیوں کا ہے۔ مَیں ہردوار میں اپنی فارمیسی (نیشنل آیورویدک فارمیسی) واقعہ نیمی ہاؤس کھیم گوڈا روڈ پر بیٹھا ہوا تھا کہ دہلی کے ایک سجّن سٹری بی بی او دھیپال آئے۔ رام سلام کے بعد اُنہوں نے بتایا کہ وہ پیراموٹ انشورنس کمپنی ہڑودہ کے سکریٹری ہیں اور دلّی آفس کے انچارج ہردوار میں اپنی کمپنی کی برانچ قائم کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں اور دو تین دنوں سے اس سلسلے میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں اُنہوں نے مزید بتایا کہ میرے متعلق انھیں یہ پتہ چلا ہے کہ میرا یہاں کافی رسوخ ہے اسلئے یہاں کا برانچ مینجر مجھے بنانا چاہتے ہیں۔

مَیں نے اُن کی باتیں سُنکر کہا "سٹر بھان جی مجھے صرف انشورنس کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ ایک حد تک نفرت بھی ہے۔ کون شکاری کتّوں کی طرح گھر گھر گھومتا رہے اور لوگوں کو اپنی انشورنس کروانے پر آمادہ کرے اسلئے مَیں معافی چاہوں گا۔"

وہ بھلا کب ماننے والے تھے اُس وقت تو چلے گئے لیکن دوسرے تیسرے دن آکر مجھے ملتے رہے اور کمپنی کی برانچ کا کام سنبھالنے پر زور دیتے چونکہ آدمی بہت دلچسپ تھے۔ اسلئے اُن سے میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ انھیں دنوں اُنکی ایک بچی سخت بیمار ہو گئی اور بعد ازاں مر گئی۔ بچی کی بیماری کے دوران مَیں اکثر اُن کے یہاں جایا کرتا جس سے ہماری واقفیت دوستی میں تبدیل ہو گئی چنانچہ اُنہوں نے ایکدن اپنی دوستی کا واسطہ دیکر مجھے انشورنس کا کام کرنے پر رضامند کر لیا۔ اور اس سلسلے میں مجھے ہر قسم کی مدد دینے کا یقین دلایا۔

مَیں نے اپنی فارمیسی کے ساتھ والی دوکان کمپنی کی برانچ کے لئے لے لی۔ اور فرنیچر وغیرہ کے لئے

آرڈر دیدیا۔ شری اودھبال نے مجھے کام سکھانے کی غرض سے مزید پانچ سات دن تک ہردوار میں رہنا منظور کرلیا۔

جب مجھے انشورنس کے کام کا ڈھنگ آگیا تب اُنہوں نے دہلی جانیکا پروگرام بنایا روانگی سے ایک روز قبل شری اودھبال نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ سورگ آشرم دیکھنے جانا چاہتے ہیں اور میں بھی اُن کے ساتھ چلوں۔ اُن کی دھرم پتنی نے میری دھرم پتنی کو بھی سورگ آشرم چلنے پر رضامند کرلیا چنانچہ ہم سب (شری اودھبال۔ اُن کی بیوی ماتاجی۔ نوکر اور مَیں اور میری بیوی) بذریعہ لبس رشی کیش پہنچ گئے۔ وہاں سے پیدل مُنی کی ریتی پہنچے جہاں سے سورگ آشرم جانے کے لئے کشتی چلتی ہے ہم وہاں کھڑے ہوئے ناؤ کا انتظار کررہے تھے کہ ایک چھوٹی کشتی میں ایک ملاح کسی افسر کو سورگ آشرم سے لیکر اُس کنارے پر آیا۔ اگرچہ میرے لئے وہ ملاح نیا تھا (دھیان رہے کہ مَیں ایک سال پہلے سورگ آشرم میں بطور منیجر رہا تھا اور سب کرمچاریوں اور ملاحوں کو جانتا تھا۔) اسلئے جب اُسے میرا نام معلوم ہوا تو وہ یہی چھوٹی کشتی (یہ کشتی مَیں نے خاص طور سے مہنت جی اور اپنے لئے بنوائی تھی اور مَیں اکثر اُس پر سوار ہوکر پار آیا کرتا تھا) اور سورگ آشرم لے جانے پر رضامند ہوگیا جب کشتی دوسرے کنارے سے چند گز کے فاصلے پر رہ گئی۔ تو ملاح پانی میں کود پڑا اور اُس نے کہا کہ کشتی کا رسہ اُس کی طرف پھینکدیا جائے۔ شری اودھبال کے نوکر نے رسے کی بجائے کشتی کا ایک چپّو اُس کی طرف پھینکدیا اتنے ہی میں کشتی کنارے سے اِدھر کھسک کر پانی کی دھار میں پہنچ گئی۔ یہ حالت دیکھکر ہم سب گھبرائے مَیں نے غصے سے ملاح سے کہا۔ ارے بھائی کشتی کو سنبھالو یہ تو پانی میں دھار کی طرف جارہی ہے تم وہاں کھڑے کھڑے ہمارا مُنہ کیا تک رہے ہو جلدی تیر کر آؤ۔ وہ بے بسی کی حالت میں بولا۔ "پنڈت جی! مَیں ملاح نہیں ہوں ایک مستری ہوں۔"

صورت حالات سخت نازک اور پریشان کن ہوگئی کشتی گنگا کی دھارا کے ساتھ

ساتھ بڑی تیزی سے نیچے کی طرف بہنے لگی۔

میں کنارے کنارے چل رہا تھا اور مدد کے لئے شور مچا رہا تھا لیکن دوپہر کا وقت تھا اور ہماری بدقسمتی سے تمام کے تمام ملاح اور بھنڈاری کھانا کھانے چلے گئے تھے۔ کوئی دوسرا ملاح مدد کے لئے نہ پہنچا ادھر کشتی میں بھی کھلبلاہٹ مچ گئی۔ مسٹر اودھ بال اور اُن کا نوکر ڈھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ تینوں عورتیں (مسٹر اودھیال کی ماتا۔ اُن کی دھرم پتنی اور میری بیوی) بھی اپنی پوری طاقت سے چلا رہی تھیں۔ اور بچاؤ بچاؤ کا شور بلند کر رہی تھیں لیکن میں اپنے خیالات میں گم کشتی کے ایک کنارے پر بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا یکایک میں نے سامنے نگاہ کی تو ایک بہت بڑی چٹان دکھائی دی۔ میں کانپ اُٹھا کیونکہ اس چٹان سے ٹکرانے کے بعد ہم سب کا ڈوب جانا یقینی تھا موت کو بالکل سامنے دیکھ کر آخری کوشش کرنیکا ارادہ کیا اور اپنے سب ساتھیوں کو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر بھگوان کا نام لینے کے لئے کہا۔ بڑی مشکل سے اُن سب کو چُپ کرایا بے چارہ ملاح کنارے پر ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا اور برابر مدد کے لئے چلا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں بھگوان کو یاد کیا اور کشتی میں رکھے ہوئے ایک ہی چپو کی مدد سے کشتی کو سنبھالنا چاہا چونکہ زندگی میں ایک ہی بار میں نے کشتی چلانا سیکھا تھا۔ اور فقط چند منٹوں کے لئے ہی کشتی چلائی تھی اسلئے میں چپو لگانا بھول چکا تھا چنانچہ جب پہلی بار چپو لگایا تو کشتی اور بھی منجدھار کی طرف بہنے لگی۔ اب میں نے اپنے ہوش و حواس صحیح سلامت رکھتے ہوئے اُلٹا چپو چلایا تو کشتی رک گئی نہ جانے اُس وقت بھگوان نے مجھ کو کیسے اتنی شکتی دیدی کہ میں تین چار منٹ کی جدوجہد کے بعد کشتی کو کنارے پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

جوں ہی کشتی کنارے پر پہنچی ملاح نے بڑھکر اُسے پکڑ لیا اور اُس کے رسّے کو ایک چٹان سے باندھ دیا۔ موت کے منھ سے بچ نکلنے کے باعث ہم سب بہت خوش تھے اور بار بار بھگوان کا نام لے رہے تھے۔ خاص طور سے عورتیں تو گنگا مائی کی جے کے نعرے لگانے لگیں مستری بہت شرمندہ تھا میں نے اُس سے پوچھا تم کب سے یہ کام کر رہے ہو؟ وہ بولا میں تو مستری ہوں۔ شوقیہ کشتی چلا لیتا ہوں۔ دوپہر کو کام سے چھٹی کی تو مہنت جی نے ڈی۔ ایف۔ او کو دوسری طرف چھوڑ کر آنے کا

حکم دیا چنانچہ میں اُنھیں لیکر اُدھر پہنچا تو آپ سب ہل گئے اور آپکے کہنے پر آپکو کشتی میں بٹھا لیا۔ میں ملّاح نہیں ہوں۔

مجھے اُس کی باتیں سُنکر غصہ تو بہت آیا لیکن موت کے مُنھ سے بچ نکلنے کی خوشی میں اپنے غصے کو فوراً پی گیا۔ اس بات کی سختی کے ساتھ اُسے تاکید کی کہ وہ آئندہ کسی شخص کو کشتی پر نہ لے جایا کرے۔ جب ہم اُوپر پہنچے تو ہم سے پہلے ہی اس واقع کی اطلاع مہنت جی کو پہنچ چکی تھی۔ اور وہ اُس مستری کو ڈانٹنے لگے۔ میں نے کہا کہ اس بیچارے کا کیا قصور۔ آپکو اسے کشتی چلانے کا کام سونپنا نہیں چاہیئے تھا یہ کشتی میں سوار ہونے سے پیشتر مجھے بتا دیتا کہ وہ ملّاح نہیں ہے بلکہ ایک مستری ہے اور کشتی شوقیہ ہی چلاتا ہے تو میں بھی اسمیں کشتی میں سوار نہ ہوتا۔ خیر جانے دیجیئے جو ہو گیا سو ہو گیا۔ شکر ہے کہ سب کی جانیں بچ گئیں۔

اتنے میں آشرم کا ایک کرمچاری ایک تھال میں لڈو لیکر پہنچ گیا۔ مہنت جی نے ہمیں پرشاد دیتے ہوئے کہا خوشدل جی آج گنگا مائی نے میرا بھی مان رکھ لیا ہے اگر آپکو کشتی میں کوئی حادثہ پیش آجاتا تو مجھے بہت ہی دُکھ ہوتا۔

میں نے کہا۔ جب آپ جیسے مہاپرش مجھ پر نظر عنایت رکھتے ہیں تو مجھے کسی بات کا خطرہ نہیں۔ واقعی آج تو بھگوان نے خاص ہی مجھ پر مہربانی کی ہے ورنہ موت کو یوں سامنے دیکھ کر کس کے ہاتھ پاؤں نہیں پھول جاتے۔ اگر اپنے ساتھیوں (سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کی مانند میں بھی بدحواس ہو جاتا تو بھگوان ہی جانتا ہے کہ ہمارا حشر کیا ہوتا۔ لیکن دُنیا میں ابھی ہمارا دانہ پانی باقی تھا۔ اسلیئے موت ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

دلِ خوشدل کسی صورت بھی غمگیں ہو نہیں سکتا
حوادث میں بھی پھنس کر اُس کو گھبرانا نہیں آتا

جب چھت گر پڑی

۶ مارچ ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے میں دوپہر کا کھانا کھا کر کوٹھے پر کچھ دیر آرام کرنے کیلئے چلا گیا بہت برسوں سے مجھے یہ عادت ہے کہ کھانا کھا کر کچھ دیر ضرور سوتا ہوں جس دن کسی خاص کام کے باعث گھنٹہ آدھ گھنٹہ دوپہر کو سونا نہ ملے اس شام کو میری طبیعت سخت بھاری ہو جاتی ہے اور بعض اوقات سر میں ہلکا ہلکا درد بھی ہو جاتا ہے چنانچہ حسب معمول میں اس دن بھی کوٹھے پر کچھ دیر آرام کیلئے پہنچا اور جس جگہ روز اپنی چارپائی بچھایا کرتا تھا وہیں اپنی چارپائی ڈال کر لیٹ گیا۔ جہاں میں ہر روز لیٹا تھا وہاں ہمارے پڑوس کے مکان کی ایک کافی اونچی دیوار تھی جس پر چھت بنی ہوئی تھی اس دیوار کے سائے میں میں ہر روز لیٹا کرتا تھا۔ اس دن جب میں چارپائی پر دراز ہوا اور ایک سگرٹ لگا کر منہ میں دبایا تو اچانک ایک نامعلوم سی وحشت میرے دل میں پیدا ہوئی خیال آیا کہ اگر میرے سوتے ہوئے یہ چھت مجھ پر گر پڑے تو میرا کیا حشر ہو اپنے انجام کا تصور کرتے ہی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے پھر اپنے اس خیال پر خود بخود ہنسی میرے ہونٹوں پر پھیل گئی کیونکہ پچھلے ایک ماہ سے میں یہاں برابر دوپہر کو آرام کرتا رہا لیکن اس دیوار کی کبھی کوئی اینٹ تک نہیں گری لیکن آج کیوں یہ چھت بیٹھ جائیگی۔ اور اسکی اینٹیں میرا قیمہ بنا ڈالیں گی یہ سوچ کر اس بھیانک خیال کو دل سے نکال پھینکا اور چادر منہ پر اوڑھ کر آنکھیں بند کر لیں — عجب بات تھی کہ کوشش کرنے پر بھی مجھے اس دن نیند نہ آئی اور بار بار چھت گر پڑنے کا اندیشہ مجھے محسوس ہونے لگا میں نے لاکھ اپنے دل کو سمجھایا لیکن نہ جانے دل سے کیوں یہی آواز آ رہی تھی کہ اٹھ آج یہاں مت لیٹ آج یہ چھت ضرور گر پڑیگی۔ ایک گھنٹہ اسی کشمکش میں گذر گیا جب کوشش کے باوجود بھی میں اپنے دل کو نہ سمجھا سکا تو تنگ آ کر میں نے اپنا بستر لپیٹا اور سامنے والے کمرے کا رخ کیا کمرے میں پہنچ کر ابھی میں اپنا بستر پلنگ پر بچھا ہی رہا تھا کہ ایکدم زور سے گڑگڑ کی آواز ہوئی اور وہ چھت گر پڑی جس چارپائی سے اٹھ کر میں ابھی ابھی آیا تھا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اگر میں دو منٹ پہلے اٹھ کر اندر کمرے میں نہ پہنچ چکا ہوتا تو میرے جسم کے پرزے اڑ جاتے اور میں یا تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا یا جسم کا کوئی عضو کٹوانے پر مجبور ہو جاتا۔ دھیان رہے کہ یہ واقعہ لاہور چھاؤنی کا ہے اور اس دن موت کے پنجے سے بچ نکلنا اس امر کا ایک واضح اور پکا ثبوت تھا کہ مقررہ دن سے پیشتر کوئی انسان موت کا شکار نہیں بن سکتا۔ چنانچہ اردو کے مشہور شاعر غالب کے اس مصرعے پر کہ "موت کا ایک دن معین ہے" میرا تو یقین اور بھی پکا ہو گیا۔

انسانی ترقی کی سب سے بڑی رُکاوٹ

انسانی ترقی میں سب سے بڑی رُکاوٹ

ایک فلاسفر نے درست ہی کہا ہے کہ "مرد کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے" تجربات شاہد ہیں اور واقعات گواہ ہیں کہ انسانیت اور روحانیت کی اعلیٰ منزلوں پر صرف وہی مرد پہنچ سکے جو عورت کی دُنیا سے دُور رہے۔ یا جن کا گھریلو جیون برائے نام تھا۔ مَیں اس نظریہ کو تسلیم کرتا ہوں کہ جنسی بھُوک بھی پیٹ کی بھوک کی مانند ہے اور ہر شخص کی اس بھوک کو مٹانے کے لئے سوسائٹی کی طرف سے بندوبست کیا جانا چاہیئے برہم چریہ بہت اچھی چیز ہے لیکن بھیشم پتا مہ کی طرح ساری عمر برہمچاری رہنا اور اپنی جنسی خواہش پر مکمل طور پر قابو پا لینا ایک عام انسان کے لئے ممکن نہیں۔ یہ کام تو ایک نہایت زبردست قوت ارادی کا مالک اور دھارمک عقیدے کا آدمی ہی کر سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے جب اپنی دھرم پتنی کستور بائی کو "ماتا" کہدیا اور آئندہ کے لئے اس سے جنسی تعلقات ختم کر لینے کی پرتگیا کی تو اپنی جنسی بھوک پر بے شک مکمل طور پر قابو پا لیا لیکن اُنہی کے آشرم میں برسوں تک رہنے والے دیگر کئی مردوں اور عورتوں کے متعلق عجیب و غریب قصے سننے میں آئے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر جاندار ہستی میں جنسی بھوک موجود ہے اور یہ شرف صرف انسان ہی کو حاصل ہے کہ وہ لگاتار ریاضت مناسب خوراک اور خیالات کی پاکیزگی کے باعث اس بھوک کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

مَیں اُن مہاتماؤں اور دھرم آچاریوں کے اُپدیشوں سے متفق نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ شادی تو فقط اولاد پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہے جنسی لذت کے لئے نہیں میرا خیال ہے کہ سو فیصدی لوگ نفسانی خواہشات کے زیر اثر بھوگ کرتے ہیں

اور اسکے نتیجے کے طور پر اولاد پیدا ہو جاتی ہے جو لوگ فقط اولاد کی خاطر ہی بھوگ کرتے ہیں
اُن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے
کہ اُس نے جنسی ملاپ سنتان کیلئے کیا یا کسی اور جذبے سے مجبور ہو کر۔

میری دو شادیاں ہوئیں پہلی شادی تو ماں باپ نے کی اور دوسری میں نے اپنی
مرضی سے۔ بے شک میں اس بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ ایک فقیر ٹاپ کا آدمی ہوتے ہوئے
بھی میں نے اپنے گھریلو جیون کو خوش گوار رکھا اور دونوں بیویوں کو اکٹھا رکھا لیکن اس حقیقت
سے میں انکار نہیں کر سکتا کہ اگر میں ایک بھی شادی نہ کرتا اور اپنی نفسانی خواہشات پر عالم جوانی
میں قابو پا لیتا تو میری زندگی ہر لحاظ سے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہوتی میں خود یہ محسوس کرتا ہوں
کہ میری پہلی شادی نے مجھے دیش کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لینے دیا اور دوسری
شادی نے میری دماغی اور روحانی ترقیوں پر کئی برسوں کے لئے بریک لگا دی۔ اگر کوئی مجھ سے
یہ سوال کرے کہ اگر میں ایک بھی شادی نہ کرتا تو میری زندگی موجودہ زندگی سے بہتر اور اچھی
ہوتی یا بری اور پریشان کُن۔ تو میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں نے
ایک بھی شادی نہ کی ہوتی تو میں اپنی زندگی میں ضرور کچھ نمایاں کام کر سکا ہوتا۔

میں دِل کی گہرائیوں سے یہ مانتا ہوں کہ جو مرد اپنی نفسانی خواہش پر جسقدر قابو پا لے
وہ اُسی قدر بلند اُٹھ سکتا ہے اور اپنے دُنیاوی یا رُوحانی نصب العین کی جانب تیزی سے بڑھ
سکتا ہے اس خواہش پر قابو پانے کے خواہشمند آدمی کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ تنہائی میں
کسی عورت کے ساتھ نہ رہے اور نہ زیادہ ہنسی مذاق کرے۔ عورت کو اپنے ساتھ ایک ہی کمرے
میں رکھنے والے مرد اپنی نفسانی خواہش پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کئی سالوں
تک تپسیا کرنے والے مردوں کو بھی جب ایکانت میں کسی عورت کے ساتھ رہنا پڑا تو وہ اپنے
نفسانی جذبے پر قابو نہ پا سکے اور برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل کی ہوئی آتمک شکتی کو
تھوڑے عرصے میں ضائع کر بیٹھے۔ اسلئے عقلمند آدمی وہی ہے جو اس سلسلے میں اپنے آپ کو

آزمائش میں نہ ڈالے اور مریادا سے آگے نہ بڑھے۔

اس باب میں میں نے تین مہاتماؤں اور ایک گرہستی بزرگ کا ذکر کیا ہے۔ سوامی کیشوانند اور دعوت کی نصیحت تو مجھے تازندگی فراموش نہیں ہو سکتی۔ دوسرے مہاتما مونی بابا کی گراوٹ کا واقعہ بھی میں جیتے جی نہیں بھول سکتا۔

تیسرے بزرگ گرہستی کا واقعہ تو عام دنیاداروں کی مانند ہے۔ ایسے کئی واقعات سب کے علم میں ہیں اور ہر شخص نے دیکھے اور سنے ہوں گے اسلئے اُنکے متعلق زیادہ لکھنا بیکار ہے۔ (پنڈت خوشدل)

بھگوان کیا کرے

قابو میں اپنا من نہ ہو تو دھیان کیا کرے
ہوش و حواس گم ہوں تو وِگیان کیا کرے
کہتے ہیں لوگ دھرم اور ایمان کچھ نہیں
اعمال ہوں خراب تو ایمان کیا کرے
پہچانتے ہیں حق کو سدا حق شناس ہی
آنکھیں ہوں جس کی بند وہ پہچان کیا کرے
دیدار اپنے بھگتوں کو دیتا ہے ایشور
بندہ نہ کرے دھیان تو بھگوان کیا کرے
جس گھر کے والدین ہوں عیاش و خود پرست
اس گھر کی بہتری بھلا سنتان کیا کرے
سب نیتا بھول بیٹھے ہوں جب اپنے فرض کو
خوشدل اکیلا دیش کا کلیان کیا کرے

اودھوت کیشوانند کی نصیحت

مجھے رشی کیش میں اودھوت کیشوانند جی سے ملنے کا موقعہ ملا جو گوسوامی گنیش دت جی کی درخواست پر اُتر کاشی سے رشی کیش میں آئے تھے اور جھاڑیوں کے قریب ایک کٹیا میں رہ رہے تھے۔ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کا ایک کام ان کی حسب منشا ہو جانے پر وہ اودھوت جی کے پرم بھگت۔ بن گئے۔ اور اپنی چند رانیوں سمیت رشی کیش آ گئے اور قریباً ایک ماہ تک وہاں رہے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے شراب اور مانس کھانا بالکل ترک کر دیا۔ اور اپنا جیون دھارنک ڈھنگ سے بسر کرنا شروع کر دیا۔ گوسوامی جی کی وساطت سے مجھے بھی اودھوت جی سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقعہ ملا اس ملاقات کو میں تازندگی فراموش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُنہوں نے ایک ایسی حقیقت میرے دل پر نقش کر دی جس نے میری زندگی کو بہتر بنانے میں کافی مدد دی۔

گوسوامی جی نے میرا تعارف کروایا تو اودھوت جی بولے۔ "پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ اگرچہ ہم پڑھے لکھے نہیں تاہم تمہارے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ میں نے عرض کیا "میں تو صرف آپکے درشن کرنے کے لئے آیا ہوں۔ کیونکہ آپکے تپ بل کی بابت بہت کچھ سُنا ہے۔ اس مرحلہ پر گوسوامی جی بول اُٹھے۔ "خوشدل جب کبھی کسی انوبھوی سنت کے پاس جاتے ہیں تو اُن سے ضرور کچھ نہ کچھ پوچھنا چاہیئے۔ اسلئے ایک آدھ سوال تو ضرور پوچھ لو۔" مجھے ایک سوال سُوجھا۔ میں نے دریافت کیا 'اودھوت جی یہ بتایئے کہ انسانی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟

"صرف ایک" اودھوت جی نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آدمی۔ اس رکاوٹ کو دُور کر لے تو اس لوک اور پرلوک میں اس کا راستہ صاف ہو جائے۔ آدھ منٹ رُک کر

اودھوت جی پھر گمبھیر آواز میں کہنے لگے۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے مہاراجہ پٹیالہ اپنی رانیوں
کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ یہ پھولوں کی مالا (اپنے گلے میں پڑے پھولوں کے ایک ہار کی جانب اشارہ
کرتے ہوئے) اُنہوں نے میرے گلے میں ڈالی اور میرے پاؤں کی مٹی اپنے ماتھے پر لگائی۔ مجھے
اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اور نہ میرے من میں یہ خیال آیا کہ میں بہت بڑا مہاتما ہوں جس کے
سامنے راجے۔ رانیاں ماتھے ٹیکتی ہیں۔ تم مجھے دو چار گالیاں دو اور یہ کہو کہ اودھوت بڑا پاکھنڈی
ہے تو مجھے تم پر ذرا بھی غصہ نہ آئیگا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ میرے دل سے عزت اور بے عزتی
کا خیال بالکل مٹ چکا ہے۔ اب رہا دولت یعنی مایا کی خواہش۔ اسکے بارے میں مجھے یہی کہنا ہے
کہ اگر تمہارے دوست گوسوامی اپنے بھگتوں یعنی راجاؤں اور سیٹھوں سے روپیہ اکٹھا کر کے مجھے
یہاں سے لیکر لاہور تک سونے کی سڑک بنا دے تو میں اس پر پیشاب کی دھار مار دوں گا۔
مجھے دھن دولت اور سونا چاندی کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اسے حاصل کرنے کیلئے کبھی میری بھاونا
ہوئی ہے۔" اور سنو۔ اب اودھوت جی کی آواز میں گمبھیرتا آگئی۔ اور انہوں نے اپنے الفاظ پر زور
دیتے ہوئے کہا۔" میری عمر اس وقت ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے میں اس وقت تک
اکھنڈ برہمچاری ہوں۔ بھوگ ولاس کی طرف میری رُچی کبھی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی آج تک میں نے
کسی استری سے بھوگ کیا ہے۔ مجھے اپنے مَن اور اپنی اِندریوں پر پورا قابو ہے اور بھگوان کی
مجھ پر بہت کرپا ہے لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر کسی جوان عورت کو
میری کٹیا میں دو چار دن رکھا جائے تو میرے مَن کی حالت کیا ہو جائے۔ اودھوت جی مسکرا کر
بولے۔" مل گیا تمہارے سوال کا جواب"؟

" جی ہاں مہاراج " میں نے عقیدت سے کہا۔ یکا یک ایک اور سوال میرے دماغ
میں اُٹھ کھڑا ہوا چنانچہ میں نے پوچھا۔" اودھوت جی۔ آپکا یہ فرمان بالکل بجا ہے کہ انسان
کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ استری ہے۔ لیکن یہ جو بڑے سنیاسی اور اُپدیشک اپنے
ساتھ چیلیاں رکھتے ہیں ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ وہ بولے۔" میری رائے میں

جو سادھو اپنی بیاہتا اِستری کی بجائے کسی دوسری استری کو چیلی بنا کر رکھتے ہیں۔ انھیں ماں، بہن، بیٹی کہتے ہیں۔ اُن پر کبھی وشواس نہ کرنا یہ سب مایا اور بھوگ میں پھنسے ہیں۔

اچھا سادھو اور بھگوان کا بھگت عورتوں سے دُور رہے گا اور اُسے اپنے پاس تک نہ آنے دیگا۔ اگر ساکھشات برہما بھی منشیہ روپ دھارن کر کے آئے اور اپنے سگے خون یعنی اپنی سگی ماں بہن یا بیٹی کے علاوہ دھرم کی بنائی ہوئی ماں، بہن یا بیٹی کو اپنے ساتھ رکھے اور ایکانت میں اُس کے ساتھ رہے تو سمجھ لینا کہ وہاں دھرم کی بجائے پاپ کا نواس ہے۔

اودھوت جی سے ملاقات ہونے سے پیشتر میں فقط سادھو سنتوں میں روپیہ پیسے کی خواہش کو دیکھ کر ہی سمجھا کرتا تھا کہ یہ صحیح معنوں میں سادھو نہیں بلکہ مایا کے لوبھی ہیں اسکے بعد میں نے اودھوت جی کی بتائی ہوئی کسوٹی پر سنتوں۔ مہنتوں اور بڑے بڑے نہامنڈلیشوروں اور اُپدیشکوں کو پرکھنا شروع کیا۔ اور میں بلا جھجک یہ کہتا ہوں کہ مجھے آج تک ایک بھی ایسا سادھو نہیں مِلا کہ جو عورتوں میں ست سنگ کرتا ہو اور اپنے ساتھ چیلیاں رکھتا ہو اور اس کے چال چلن کے بارے میں افسانے نہ سُنے گئے ہوں۔

قطعہ

نہ جانے حشر کیا ہوگا خدایا تیری دُنیا کا
گناہ آلودہ ہر اک رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے
جسے دیکھو خدا کی ذات سے منکر ہے خود بیں ہے
ہر اِک چھوٹا بڑا مایا کا قائل ہوتا جاتا ہے

مونی بابا کی گراوٹ

۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں مَیں نے دو دوستوں کے ساتھ سورگ آشرم پہنچا تو معلوم ہوا کہ بھوت ناتھ باغیچہ سے اوپر جاکر ایک گپھا میں ایک بنگالی مہاتما رہتے ہیں جو بالکل ننگے رہتے ہیں اور جنھوں نے دس بارہ سالوں سے مَون دھارن کر رکھا ہے یعنی بالکل چپ رہتے ہیں مَیں نے جب سورگ آشرم کے ایک کرمچاری سے اس مہاتما سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ بولا! کہ وہ کبھی کبھار نیچے آتے ہیں اور ایک دو پھلکے یعنی روٹیاں ہاتھ میں لیکر پھر واپس ہو جاتے ہیں کسی شخص سے نہ کچھ بولتے ہیں اور نہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص انھیں ملنے کے لئے اوپر گپھا میں جائے تو اُسے پتھر مارتے ہیں یہ باتیں سُنکر میرا حوصلہ پست نہ ہوا اور مَیں نے اپنے ساتھیوں کو اوپر جانے پر رضامند کر لیا۔

رات کو ہم سورگ آشرم میں ٹھہرے اور صبح سویرے اُٹھ کر باغیچی کی طرف اوپر چڑھنے لگے۔ آدھ میل جانیکے بعد دیکھا ایک اوپر سے پتھر آنے شروع ہو گئے۔ لیکن ہم خوف زدہ نہیں ہوئے کیونکہ ایک لمحہ کھڑے ہو کر جب مَیں نے اُس ننگے مہاتما کو پتھر پھینکتے ہوئے دیکھا تو اندازہ کر لیا کہ یہ ہم کو ڈرانے کے لئے پتھر پھینک رہا ہے، ہمیں زخمی کرنے کے ارادے سے نہیں۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو ہم تینوں کے سر ضرور پھوڑ سکتا تھا۔ خیر ہم اوپر پہنچ گئے۔ مہاتما جی کو پرنام کیا تو وہ مُسکرائے اور اپنے پیچھے آنیکا اشارہ کیا۔ ہم سب اُن کے پیچھے چلکر ایک گپھا میں پہنچے جہاں وہ رہتے تھے ایک سلیٹ پر ہندی میں لکھ کر مجھ سے پوچھا کہ کیوں آئے ہو!... مَیں نے جواب میں لکھدیا آپکے درشنوں کے لئے۔ اُنہوں نے دوسرا سوال کیا کچھ پوچھنا ہو تو پوچھو۔ مَیں نے پوچھا ہمارا دیش آزاد کب ہوگا

اُنہوں نے لکھا پندرہ سالوں کے اندر اندر۔ میرے دوسرے دوست (جگدیش مِتر کوشل) نے بھی ہندوجاتی کے متعلق کچھ سوالات پوچھے۔ تیسرے ساتھی (بابو رام) نے کچھ دریافت نہ کیا ہم تینوں آدھ گھنٹہ تک وہاں رہے اور مہاتما جی کی شخصیت سے کافی متاثر ہوئے۔ یکایک مجھے ایک بات کا خیال آیا۔ اور مَیں نے سلیٹ پر لکھدیا۔ مونی بابا مُسکرائے۔ جواب دیا ضرور پنجاب آئیں گے اور ویدِ دیا کا پرچار کرینگے لیکن ایک دو سال کے بعد۔

سال ڈیڑھ سال کے بعد میرے دوست جگدیش مِتر کوشل کے پتا سورگباس ہو گئے وہ جب اُن کے پھُول لیکر ہردوار جانے لگے۔ تو مجھے مونی بابا کی یاد آگئی۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ وہ اُن سے ملیں اور اگر مہاتما جی پنجاب آنے پر رضامند ہوں تو اُنھیں اپنے ساتھ لیتے آئیں ایک ہفتہ کے بعد اطلاع ملی کہ میرا دوست مہاتما جی کو لیکر آرہا ہے چنانچہ مَیں نے دھرم پورہ میں مہاتما جی کی رہائش کا انتظام کروایا اور دو تین جگہوں پر اُن کے لیکچروں کا بندوبست بھی کر دیا۔

جب مہاتما جی دھرم پورہ پہنچے تو اُن کے سواگت کے لئے کافی آدمی موجود تھے۔ مَیں اُس وقت رات کے جلسے کے انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ اسلئے اپنے۔۔۔۔ دو دوستوں کی ڈیوٹی مہاتما جی کی رہائش اور اُن کے بھوجن وغیرہ کا انتظام کرنے پر لگادی تھی۔ دوپہر بعد جب مَیں پہنچا تو بھیڑ کم ہو چکی تھی مَیں نے مہاتما جی کے چرن چھُوئے اُنہوں نے مجھے آشیرواد دیا۔ لیکن جوں ہی مَیں نے اُن کے چہرے پر نگاہ ڈالی مَیں حیران رہ گیا۔ دو سال پہلے جو لالی اور چمک مہاتما جی کی آنکھوں میں دیکھی تھی وہ بالکل غائب تھی۔ اور اُس کی جگہ اُن کی آنکھیں بالکل پھیکی اور اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ نیز اُن کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی تھے اُن کی یہ حالت دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا دل میں ایک شُبہ نے سر اُٹھایا اور دوسرے لمحہ مَیں نے اپنے دوستوں کو چند منٹ کے لئے باہر جانے کو کہدیا جب اس کمرے میں مَیں اور مہاتما جی ہی رہ گئے تو مَیں نے صاف صاف کہدیا۔

"بھگون! آپکی آنکھوں اور چہرے سے وہ تیج کہاں اُڑ گیا۔ جو مَیں نے دو سال پہلے دیکھا تھا۔ یقیناً آپ میں کچھ گراوٹ آچکی ہے۔"

میرا اتنا کہنا تھا کہ موتی بابا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے نکل کر اُنکی گالوں پر پھیل گئے۔ وہ روندھے ہوئے گلے سے بولے خوشدل تم نے خوب پہچانا۔ میں اپنے مقام سے بہت گر گیا ہوں۔"

لیکن کیسے ؟ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

گمبھیر آواز سے کہنے لگے۔ ایک پہاڑی عورت دودھ لیکر اکثر اُس راستے سے جایا کرتی تھی کبھی بار مجھے بھی دودھ دے گئی۔ اُس کا آنا جانا بڑھ گیا۔ اور میں اپنی برسوں کی کمائی کو اُسپہ لُٹا بیٹھا۔ یہ کہہ کر موتی بابا خوب روئے میں نے اُنھیں تسلی دی۔ کافی دیر کے بعد اُنہوں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ اب کیا ارادہ ہے؟ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ میں نے جس تیج کے باعث آپکو یہاں بُلایا تھا جب وہی نہیں رہا تو پبلک میں آپکے لیکچروں اور یوگ کے طریقوں کے سُنانے سے کیا حاصل۔ بہتر ہے کہ آج رات کو لاہور چھاؤنی براہمن سبھا میں آپ لیکچر دیدیں کیونکہ وہاں کا سب بندوبست میں نے کر رکھا ہے۔ اور اس سلسلے میں منادی بھی کروادی ہے لیکن اسکے بعد کے تمام پروگرام منسوخ کر دیئے جائیں گے اور آپ اپنے ٹھکانے یا جس جگہ آپ چاہیں چلے جائیں"۔

میں نے اپنے دوستوں کو جب صورت حالات بتائی۔ تو سب نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور اگلے دن ہی موتی بابا کو وہاں سے واپس بھیجدیا گیا۔

عورت اور خدا

بہت سے مرد ہیں ایسے جہاں میں
خدا کو بھی جو خاطر میں نہ لائیں
مگر دیکھیں جہاں عورت کی صورت
وہیں قدموں میں جاکر سر جھکائیں

بزرگی کی مٹی پلید

ایک بار مَیں گوجرانوالہ سے بذریعہ بس موٹر لاہور آرہا تھا۔ اُسی بس (BUSS) میں میرے ساتھ ایک بزرگ بیٹھے تھے عمر قریباً ستّر سال کی ہوگی سر اور داڑھی کے بال اُنکے برف کی مانند سفید تھے۔ راستے میں بات چیت کے دوران نوجوانوں کی بے راہ روی اور اُنمیں بڑھتی ہوئی فیشن پرستی اور عیّاشی کا ذکر چل پڑا مَیں نے جب یہ کہا کہ نوجوانوں کی موجودہ خودسری اور نفس پرستی کے لئے اُن کے والدین اور بزرگ ذمّہ دار ہیں تو سردار صاحب بھڑک اُٹھے۔ نوجوانوں کے متعلق اُنھوں نے کہا کہ فحش لٹریچر پڑھنے کا شوق اور سینما بینی نے آج اُن کو بدچلن کر دیا ہے۔ بزرگوں کا اسمیں کوئی قصور نہیں۔ کون سا ایسا باپ یا بزرگ ہے جو یہ چاہتا ہو کہ اُس کی اولاد اور بچّے خودسر اور آوارہ ہو جائیں۔ مَیں نے عرض کیا کہ بے شک کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اُسکی اولاد جوان ہوکر غلط راستہ اختیار کرے لیکن والدین اپنے بچّوں کو اچھے راستوں پر چلنے کا نہ تو اُپدیش دیتے ہیں اور نہ ہی بچپن میں اُن کی مناسب خبرگیری کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچّے بڑے ہوکر آوارہ ہو جاتے ہیں اور بُری سوسائٹی کے شکار بنکر اپنے اصلی راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے جس کے باعث بچّے بگڑ جاتے ہیں اور وہ ہے گھر کے بزرگوں میں نفسانی خواہش کا بڑھا ہوا جذبہ۔ جب والدین اپنے بچّوں کے سامنے ایسی حرکات کرتے ہیں تو اُن کے معصوم دلوں پر یقیناً بُرا اثر پڑتا ہے اور وہ بھی ان حرکات کو چوری چھپے کرنے لگتے ہیں۔

سردار صاحب میری سب باتوں کو کاٹتے جاتے تھے اور نوجوانوں کی غلط کاریوں کے لئے

والدین کو بالکل بری الذمہ سمجھتے تھے اور بار بار یہ کہتے تھے کہ بچوں کو بگاڑنے میں ماں باپ کا کوئی ہاتھ
نہیں ہوتا بلکہ اُن کو غلط راستوں پر لے جانے والی ایک تو سکولوں کی تعلیم ہے اور دوسری سینما بینی
مَیں نے بہتیرا سردار صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بچوں کا مستقبل بنانے میں والدین کا
زیادہ ہاتھ ہوتا ہے لیکن وہ نہ مانے اور اپنی ضد پر اڑے رہے۔ جب موٹر بس بڈھا دریا کا پل
پار کر چکی تو سردار صاحب نے اونچی آواز میں کہا۔ "ذرا روک کے" اور اپنا سامان سنبھالنا شروع
کیا۔ مَیں نے کہا کہ آپنے تو فرمایا تھا کہ آپ ریلوے اسٹیشن کے موٹر اڈے پر اُتریں گے اور پہلی
گاڑی سے امرتسر چلے جائیں گے لیکن اب آپ یہیں اُتر رہے ہیں۔ کیا کوئی ضروری کام یاد
آگیا ہے؟

وہ بولے "ہاں۔ ایک شخص سے ملنا ہے۔ اُسے ملکر ہی ریلوے اسٹیشن پہنچونگا۔ اتنے میں
بس ٹھہر گئی اور سردار صاحب اپنا سوٹ کیس لیکر اُتر گئے۔ بس روانہ ہوئی۔ تو مَیں نے کھڑکی
میں سے سر نکال کر دیکھا۔ وہ بزرگ ہیرا منڈی کی اُس گلی کی طرف جا رہے تھے جسمیں طوائفیں
رہتی تھیں۔ میرے دل میں ایک شبہ نے سر اُٹھایا اور مَیں بھی اگلے موڑ پر اپنا جھولا اُٹھا کر بس سے
اُتر گیا۔ سردار صاحب کی تلاش میں اُسی گلی میں گھسا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا وہ بزرگ
ایک ویشیا سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ مَیں وہیں کھڑا ہو گیا اور جب سردار صاحب
آگے چلے تو مَیں بھی اُن کا تعاقب کرنے لگا۔ آخر دو تین طوائفوں سے بات چیت کرنے کے بعد وہ
بزرگ ایک طوائف کے کمرے میں داخل ہو گئے اور کمرہ بند ہو گیا۔ مَیں بھی اُس بند کمرے کے سامنے
جا کر کھڑا ہو گیا۔ تا کہ جب سردار صاحب اپنی نفسانی خواہش پوری کر کے باہر نکلیں تو اُن کو
شرمندہ کر سکوں۔

اسی دوران لاہور کے ایک کالج کے چند لڑکے بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ مجھے جانتے تھے
اُنہوں نے جب مجھے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ پوچھی تو مَیں نے سردار صاحب سے اپنی موٹر بس میں گفتگو
اور نوجوانوں کے لئے اس بزرگ کے دل میں نفرت کے جذبے کی بابت بھی بتا دیا اور کہا کہ دیکھی حضرت

اس بند کمرے میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں اور میں اُن کا یہاں منتظر ہوں۔ اُن نوجوانوں نے جب یہ بات سنی تو ایک بولا۔ ماسٹر جی (یہ لڑکے ماڈل ٹاؤن لاہور میں رہتے تھے اور چونکہ میں وہاں ڈرامٹک کلب کا ڈائریکٹر کافی عرصہ تک رہا اسی لئے وہاں کے سب لوگ مجھے "ماسٹر جی" کے نام سے پکارتے تھے۔) آپ ذرا سامنے والی گلی میں چلے جائیں اور ہمیں سردار صاحب کو سبق سکھانے دیجئے۔ میں نے کہا کہ ایک شرط پر۔ اور وہ یہ کہ تم لوگ اُس بزرگ پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤ گے۔ ہاں اُس کو تھوڑا سا ذلیل اور شرمندہ ضرور کرو گے۔ وہ نوجوان میری بات مان گئے اور میں وہاں سے ہٹ کر سامنے والی گلی میں آ گیا اور وہ لڑکے وہیں کھڑے رہے جب کمرے کا دروازہ کھول کر سردار صاحب اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لیکر گلی میں پہنچے تو ایک لڑکے نے سردار صاحب کا منہ کالا کر دیا۔ وہ ایک حلوائی کے توے سے اپنے دونوں ہاتھ کالے کر لایا تھا اور وہی ہاتھ اُس نے سردار صاحب کے چہرے پر پھیر دیئے۔ سردار صاحب گالیاں نکالنے لگے تو میں بھی سامنے آ گیا اور میں نے طنزیہ کہا "سردار صاحب۔ ست سری کال۔ آپ تو نوجوانوں کو لگاڑنے کا ذمہ دار بزرگوں کو سمجھتے ہی ہیں لیکن آپکی اس حرکت کا نوجوانوں کے اخلاق پر کیا اثر پڑے گا؟۔

سردار صاحب کا رنگ فق ہو گیا کہاں تو وہ اُن لڑکوں کو گالیاں نکال رہے تھے اور اب مجھے دیکھتے ہی شرم سے اُنہوں نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور خاموش ہو گئے۔

لڑکوں کا ارادہ تو اُن کا جلوس نکالنے اور زیادہ ذلیل کرنے کا تھا لیکن میں نے اُنھیں سمجھایا کہ ان کے لئے اتنی ہی سزا کافی ہے۔ شائد اس ندامت کا ان کے من پر اچھا اثر پڑے اور یہ اپنی اس کمزوری پر آئندہ کے لئے قابو پا سکیں۔

ایک شعر

گلشن کے پاسباں جنہیں سمجھے تھے ہم وہی
کلیوں کے چٹکیوں میں کلیجے مسل گئے

سوامی پربودھ چیتن کی فراری

جب سنہ ۱۹۴۲ء میں اپنے بال بچوں سمیت میں رشی کیش میں رہ رہا تھا تو میں نے اُن دنوں گرد و نواح کے نامی گرامی سادھوؤں سے ملاقاتیں کیں اور اُن کے حالات معلوم کئے۔ چنانچہ مجھے اس سلسلے میں سخت مایوسی ہوئی جن جن سادھوؤں کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ وہ بہت پہنچے ہوئے اور بہت اچھے مہاتما ہونگے۔ انھیں جب ذرا قریب سے دیکھا تو دل کو ٹھیس لگی۔ مثلاً ایک سادھو کے متعلق سُنا تھا کہ اُنھیں کوئی سِدھی حاصل ہے اور سورگ آشرم میں کئی سال صرف آلو کھا کر رہے تھے۔ میں اُن کے درشنوں کے لئے پہنچا۔ پہلی ملاقات میں ہی مجھے اُن سے نفرت ہو گئی۔ خاص سبب اُس کا یہ تھا کہ اُنہوں نے خود پچاس سال کے ہوتے ہوئے بھی ایک اٹھارہ سالہ بنگالی لڑکی سے شادی کر رکھی تھی۔ جب میں نے اُنھیں یوگ کا کوئی ایسا سادھن بتانے کو کہا کہ جس کے ذریعہ میری یکسوئی میں اضافہ ہو جائے تو اُنہوں نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "خوب لال تم نے ابھی بتایا ہے کہ تم ڈبل گرہستی ہو۔ یعنی تمہاری دو دو دھرم پتنیاں ہیں۔ بلکہ تمہیں یوگ کا ایک ایسا طریقہ بتاؤں گا کہ تم ایک رات میں دونوں کے ساتھ کئی بار بھوگ کر سکو اور تمہاری طاقت بھی بنی رہے۔" یہ سُنکر مجھے غصہ آگیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ مسکرا کر کہا۔ "یوگیراج جی ابھی تو میں جوان ہوں جب آپکی طرح بوڑھا ہو جاؤں گا تو ضرور مجھے ایسے یوگ کی ضرورت پڑے گی۔" کچھ دیر گپ شپ لڑانے کے بعد میں چلا آیا اور اسکے متعلق جو کچھ میں نے پنجاب میں سُن رکھا تھا اسکے خلاف اُن کا جیون دیکھ کر مجھے کافی دُکھ ہوا۔

انھیں دنوں ایک واقعہ نے میرے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ میں نے سادھوؤں کے متعلق اپنے خیالات ایک اخبار میں چھپوائے۔ وہ اخبار رشی کیش میں "بابا کملی والے" کی لائبریری میں بھی پہنچا

ایک نوجوان سادھو جس کا نام غالباً پرمودھ چیتن تھا - ان دنوں بابا کملی والے چھیتر کے انتظامیہ معاملات میں کافی دخل رکھتا تھا - وہ اس وقت رشی کیش نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی کا وائس چیرمین بھی تھا اور اچھا خاصا پڑھا لکھا تھا - اُس نے بھی وہ میری نظم پڑھی - یا سُنی - اور اگلے دِن جب مَیں تربینی گھاٹ سے گھر واپس جا رہا تھا تو راستے میں مِلا اور پوچھنے لگا "کیا آپ کا نام پنڈت خوشدل ہے ؟

"جی ہاں" مَیں نے کہا -

وہ جو سادھوؤں کے خلاف نظم چھپی ہے آپ ہی نے لکھی ہے " ہاں جناب " مَیں نے جواب دیا -

اب وہ ذرا گرم ہو کر بولا - خوشدل صاحب - آپ اس وقت سادھوؤں کی نگری میں رہ رہے ہیں یہاں ایسے شخص کو ہرگز نہیں رہنے دیا جائے گا جو سادھوؤں کو لفنگے - بدمعاش - آلسی اور حرام خور سمجھتا ہے "

مَیں نے نرمی سے کہا - "نظم کے اوپر میرا نوٹ آپنے پڑھا ہے مَیں نے جسمیں لکھا ہے دو تین فیصدی سادھو ایسے ہیں جنکے آگے خود بخود سر جھک جاتا ہے - ہاں بیشتر سادھو غنڈے - بدچلن اور مجرمانہ ذہنیت کے ہیں" وہ ذرا اور گرم ہو کر بولا - "آپ یہ الفاظ واپس لیں اور جس پرچے میں (غالباً روزانہ "سوراجیہ" دہلی میں وہ میری نظم شائع ہوئی تھی) وہ چھپی ہے اسمیں فوراً تردید بھیجیں ورنہ آپکو یہاں رہنے نہ دیا جائیگا"

اب گرم ہونیکی میری باری تھی مَیں نے ذرا گرجدار آواز میں کہا - "کیا مَیں جان سکتا ہوں کہ آپ کس حیثیت سے مجھے ایسا کہہ رہے ہیں ؟ مَیں یہاں کا سب کچھ ہوں - کمیٹی کا پردھان ہوں - کالی کملی والے چھیتر کا ایڈوائزر ہوں - اور یہاں کا سب سادھو سماج میرے ساتھ ہے آپ ایک ہفتہ کے اندر یا تو اس نظم کے لئے سادھو سماج سے معافی مانگ لیں - یا یہاں سے چلے جائیں - اگر آپنے ایسا نہ کیا تو آپ سخت مُصیبت میں پھنس جائیں گے -"

یہ کہہ کر وہ غصے میں گنگا جی کی طرف چلدیا مَیں نے گھر آ کر صورت حالات پر غور کیا دِل میں یہ فیصلہ کیا کہ اس نظم کے متعلق معافی مانگنا تو درکنار بلکہ ایک آرٹیکل کے ذریعہ سادھوؤں کی موجودہ پستی پر مُفصل روشنی ڈالونگا -

دو تین دنوں ہی میں اُس نوجوان سادھو نے میرے خلاف رشی کیش کی فضا کافی زہریلی کر دی -

اُن دنوں رشی کیش کی آبادی بہت کم تھی۔ سادھوؤں کی تعداد شاید ڈیڑھ دو ہزار تھی۔ اور سفید پوش گرہستیوں کی تعداد قریباً ایک سو تھی۔ اسلئے مَیں جدھر سے گزرتا سادھوؤں کی ٹولیاں میری طرف اشارہ کرکے آوازیں کستیں۔ بلکہ دو تین سادھوؤں نے تو مجھے گالیاں بھی دیں۔ مَیں نے جب تین چار گرہستیوں سے اس سادھو کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا وہ کافی بااثر اور بہت چلتا پُرزہ ہے اور اسکے ساتھ غنڈے سادھوؤں کی کافی تعداد ہے۔ چنانچہ مَیں نے اُس سے ٹکر لینے کا پکا فیصلہ کر لیا۔ اور اس خیال سے کہ وہ غنڈے سادھوؤں کے ذریعہ سربازار میری بیویوں کی بے عزّتی نہ کرا دے۔ مَیں نے اپنی دونوں دھرم پتنیوں کو پنجاب بھیجدیا۔

اُس سادھو سے میرا کافی جھگڑا چلا۔ آیورویدک کالج میں پڑھنے والے کچھ نوجوان میرے ہمخیال بن چکے تھے۔ اور جب مَیں گھر سے باہر نکلتا تو تین چار نوجوان لٹھ لئے میرے ساتھ بھی ہوتے تھے۔ چند مہینے اسی کش مکش میں گذر گئے۔ ایکدن مجھے معلوم ہوا کہ سادھوؤں کا وہ ٹھیکیدار اور رشی کیش کا خدا ایک نوجوان شادی شُدہ عورت کو لیکر رشی کیش سے فرار ہو گیا بعد ازاں اطلاع ملی کہ اُس نے لال کپڑے اُتار کر سفید لباس زیب تن کر لیا ہے اور بنارس (واراانسی) میں کپڑے کی دوکان کھول لی ہے

یہاں یہ امر ظاہر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی مضمون کے شروع میں جس یوگراج کا مَیں نے ذکر کیا ہے اور جنھوں نے مجھے یوگ کی بجائے بھوگ کا سادھن سکھانے کی پیش کش کی تھی۔ انھیں یوگیراج جی کی نوجوان دھرم پتنی کو سوامی پربودھ چیتن بہ گا کر لے گیا اور بنارس پہنچکر اُس نے شادی کر لی۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس نوجوان سادھو نے اپنی تمام عزّت اور شہرت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی نفسانی خواہش کے زیر اثر اُسی یوگی راج کی نوجوان عورت سے ناجائز تعلقات پیدا کر لئے اور پھر اُسے لیکر رشی کیش سے فرار ہو گیا۔

اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی ترقی میں سب سے بڑی رُکاوٹ 'عورت' ہے۔

نام بڑے

لیکن

درشن چھوٹے

نام بڑے لیکن درشن چھوٹے

دُنیا میں بعض ایسے بھی اشخاص ہیں کہ جن کی بابت ہم اخبارات میں پڑھکر یا اپنے جاننے والے چند اصحاب سے سُنکر اپنی یہ رائے بنا لیتے ہیں کہ وہ ہر لحاظ سے بُلند و بہتر ہوں گے لیکن جب ہمیں اُن لوگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مِلتا ہے تو ہم اپنی قائم شُدہ رائے میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ہمارے دِلوں میں اُن نام نہاد بڑے اشخاص کے متعلق کوئی احترام باقی نہیں رہتا۔

مَیں بہت سے ایسے بڑے آدمیوں سے مِلا ہوں کہ جن کی شہرت بہت اچھی ہے اور انکی نیک دِلی، ہمدردی، اصول پرستی اور چال چلن کی پختگی کے قصّے بھی کچھ لوگ بیان کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کے نزدیک جاکر مجھے معلوم ہوا کہ اُن لوگوں میں ایک دو ایسی خامیاں ہیں کہ جن کے سامنے اُنکی تمام خوبیاں ماند پڑ جاتی ہیں چنانچہ مَیں نے اس باب میں ۲ ۸ ایسے آدمیوں کے متعلق اپنے تجربات درج کئے ہیں جو ہندوستان کے کئی حلقوں میں بہت مشہور ہیں اور جن کی زندگیوں کے تاریک پہلو بہت کم لوگوں کی نظروں کے سامنے آئے ہیں بلکہ جو مَیں نے محسوس کیا وہ بھی زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا کیونکہ دُنیا میں ایسے اشخاص بہت کم ہیں جن میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں اور انہیں کوئی خامی نہ ہو۔ خود مجھ میں بھی کئی خامیاں ہیں اور ان کا اظہار اکثر مَیں بلا جھجک کر دیتا ہوں۔ اسلئے میری اس جرأت پر کسی "بڑے آدمی" کو ناراض نہ ہونا چاہئیے۔

پنڈت خوشدل

سوامی شوانند سرسوتی

پہلے پہل میں ان سے ۱۹۳۴ء میں ملا۔ ایک دن اپنے ایک ساتھی بابو رام کے ساتھ سورگ آشرم سے آ رہا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ رام تیرتھ لائبریری میں ایک ایسے مہاتما آئے ہیں جو ریٹائرڈ سول سرجن ہیں اور بہت انوبھوی اور لائق شخص ہیں۔ میں اُن کے درشنوں کیلئے اُن کی کٹیا میں گیا اس وقت وہ ایک کمرے میں رہ رہے تھے لیکن بعد ازاں وہاں لاکھوں روپے کی عمارتیں تعمیر ہو گئیں میرا ساتھی تو جوتے اُتار کر اندر جا بیٹھا جب میں اپنے بوٹ اُتار کر کمرے میں داخل ہونے لگا تو کیا ایک سوامی جی کی آواز گونج اُٹھی۔

DO'NT COME IN- FIRST LET ME KNOW ;

ARE YOU REGULAR IN YOUR PRAYERS ?

اندر مت آؤ۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ کیا تم باقاعدہ پرارتھنا کرتے ہو ؟

"NO SIR"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں جناب"

ARE YOU REGULAR IN YOUR MEALS? اُنہوں نے پوچھا!

یعنی کیا تم کھانے میں باقاعدہ ہو۔

"YES SIR"

میرا جواب تھا۔ ہاں جناب

WHICH IS NECESSARY? وہ بولے

یعنی دونوں میں سے کونسا کام ضروری ہے۔

BOTH ARE NECESSARY میں نے کہا دونوں ہی ضروری ہیں

اب سوامی جی اپنے آسن پر کھڑے ہو گئے اور گرج دار آواز میں کہنے لگے۔

"YOU ARE GIVING THE ESSENCE OF YOUR LIFE TO YOUR WIFE. WHAT WILL YOU GIVE TO GOD.

I CAN READ BY YOUR FACE THAT YOU ARE A GREAT SOUL AND YOU CAN DO WONDERS IN THE WORLD BUT YOU WILL HAVE TO CHANGE YOUR PRESENT LIFE."

تُم اپنی زندگی کا جوہر تو اپنی عورت کو دے رہے ہو۔ پرماتما کو کیا دو گے میں تمہارے چہرے سے پڑھ سکتا ہوں کہ تمہاری رُوح بہت مہان ہے اور تم دُنیا میں حیرت انگیز کام کر سکتے ہو لیکن تمہیں اپنی موجودہ زندگی میں تبدیلی کرنی ہو گی۔ سوامی جی چار پانچ منٹ تک انگریزی میں بولتے رہے۔ میرے دِل پر اُن کی گفتگو کا گہرا اثر پڑا۔ اور میں اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اُس وقت اُن کی آنکھوں میں ایک خاص تیج تھا جس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ مہاتما واقعی ایک تپسوی روشن ضمیر اور غیر معمولی طاقت کا مالک ہے چنانچہ چند منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے ہر روز شام کو اُن کے پاس آکر یوگ آسن سیکھنے کا وعدہ کر لیا میں متواتر ایک ہفتہ تک اُن کے پاس جاتا رہا۔ اُنہوں نے مجھے یوگ آسنوں کے ذریعہ ورزش کرنے کا طریقہ بتایا۔ ایک ہفتہ میں وہ مجھ سے کافی گھل مِل گئے۔ ایک سال بعد میری اُن سے ملاقات لاہور میں لوہے والے تالاب پر ہوئی جہاں آل انڈیا سنکیرتن سمیلن ہو رہا تھا وہاں اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک سوسائٹی (DIVINE LIFE SOCIETY) بنا رہے ہیں۔ چنانچہ انبالہ تک میں اُن کے ساتھ گیا اور اُن سے کافی بات چیت ہوئی۔ اُن دنوں اُن کے لیکچروں میں ایک عجیب قسم کا جوش ہوتا تھا اور جب وہ کیرتن کرتے تھے تو دیکھنے اور سُننے والے بہت متاثر ہوتے تھے

دو چار ملاقاتوں کے بعد ایکدن سوامی جی نے مجھے ڈیوائن لائف سوسائٹی کے لئے کام کرنے کی دعوت دی.
میں نے کہا کہ کچھ عرصہ اس سوسائٹی کی سرگرمیاں دیکھ کر ہی میں اس میں کام کرنے کے متعلق کچھ طے کر سکونگا.
سنہ ۱۹۳۷ء میں جب میں ہردوار گیا تو پھر سوامی جی سے رشی کیش میں جا کر ملا. اُس وقت اُنہوں نے
میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں ایک دھارمک یا روحانی رسالہ نکالوں میں نے عرض کیا کہ نہ
تو مجھے سنسکرت آتی ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں میرا کچھ مطالعہ یا تجربہ ہے پھر میں کیسے کوئی ایسا
ماہنامہ چلا سکوں گا اسکے علاوہ روپیہ کا بھی سوال ہے. سوامی جی نے وشواس دلایا کہ وہ ہر طرح
میری امداد کرینگے. اور اگلے سال تک دو ہزار روپیہ میرے رسالے کے لئے اکٹھا کر دیں گے چنانچہ
میں نے ہاں کر لی. سنہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں میں نے ہفتہ وار "بیر بیراگی" ایک واقف کار کے ساتھ
ملکر لاہور چھاؤنی سے نکالا. سوامی جی نے مجھے لکھا کہ میں کمبھ کے موقعہ پر یعنی ۱۳ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء
کو رشی کیش پہنچوں اور دھارمک ماہنامہ کا پہلا پرچہ چھپوا کر لاؤں.

میں نے اپنے عزیز دوست شیام لال سے مشورہ کرنے کے بعد ایک ماہنامہ کا ڈکلریشن یہاں
داخل کیا. "سنکیرتن" نام کا پہلا پرچہ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء میں نکال دیا. اپنے دو دوستوں (شری
شیام لال اور شری جگدیش مستر کوشل) کے ساتھ ہردوار آیا. اور رشی کیش میں جا کر سوامی جی سے
ملا. اُن دنوں وہ ہندی پڑھنا تو درکنار اچھی طرح ہندوستانی بھی بول نہ سکتے تھے اسلئے انگریزی
میں بات چیت کرتے تھے.

میں نے جب "سنکیرتن" کا پہلا پرچہ پیش کیا تو اُس کا (GET UP) گیٹ اپ دیکھ کر بہت
خوش ہوئے. اُنکے سکریٹری کا نام سروپانند تھا. (یہی، وہی سادھو تھا جس کو لاہور میں کچھ نوجوانوں نے
جوتوں کا ہار پہنایا. اور جسے سوامی شوانند کو اپنی سوسائٹی سے الگ کرنا پڑا.) وہ اردو، ہندی
اور انگریزی زبان اچھی طرح لکھ پڑھ سکتا تھا. اُن دنوں سوامی جی کے انگریزی بھاشنوں کا ترجمہ
بھی وہی کیا کرتا تھا. بہت چلتا پُرزہ آدمی تھا. اُس نے میرے رسالے کی دو کاپیاں اپنے پاس رکھ لیں
اور کل آنے کو کہا. اگلے دن میں گیا اور سوامی شیوانند جی سے ملا تو اُنہوں نے سنکیرتن کی بہت

تعریف کی اور کہا کہ مَیں جاکر سروپانند سے رسالہ کے متعلق بات چیت کروں ۔ مَیں سروپانند سے
ملا تو انہوں نے بھی پرچہ کی جی کھول کر تعریف کی ۔ اور بتایا کہ رسالے کے لئے ڈیڑھ ہزار کے
قریب روپیہ ایک ہفتہ کے اندر اندر اکٹھا ہو جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ شام کو ڈیوائن لائف سوسائٹی
کی میٹنگ ہے اور اس میں میگزین کے متعلق پورا فیصلہ ہو جائیگا۔ مَیں یہ سُنکر خوش ہو گیا لیکن اگلے
لمحہ ہی اُنہوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "خوشدل ہمارے سوامی جی تو بھولے بابا ہیں لیکن مجھے تو
یہ سوسائٹی چلانی ہے اور سوسائٹی چلانے کے لئے کافی روپیہ چاہیئے۔ جب تک گورو ڈم نہ پھیلایا جائیگا
لوگ پیسہ نہ دیں گے۔ اسلئے آپکو اس رسالہ میں سوامی جی کے متعلق خوب پرچار کرنا ہو گا۔ مَیں نے
کہا کہ آپ اپنے دِل کی بات ذرا کھول کر کہیں۔ وہ بولے " میری خواہش ہے کہ دیال باغ آگرہ کی
طرح یہاں بھی ایک عالیشان بستی بس جائے۔ اور سینکڑوں اشخاص مستقل طور پر یہاں رہیں
آپکے رسالہ کا تمام خرچہ سوسائٹی دے گی اور آپکو بھی گزارے کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملا کرے گا
لیکن آپکو بطور پراپیگنڈا سکریٹری بھی کام کرنا ہو گا۔ سوامی سروپانند جی کی باتیں سُنکر مَیں
سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد مَیں نے کہا " دیکھئے مَیں گورو ڈم کے سخت خلاف ہوں اسلئے
آپکے ساتھ مِلکر کام نہ کر سکوں گا۔ مجھے اگر پہلے اپنی اسکیم کے متعلق سوامی جی (مُراد سوامی شیوانند جی)
بتا دیتے تو مَیں کبھی یہ رسالہ نہ نکالتا۔ اس رسالہ میں تو دھارمک اور معرفت کے آرٹیکل اور نظمیں ہی
چھپیں گی کسی شخص کا پراپیگنڈہ مَیں نہ کر سکوں گا۔ چاہے آپ اس میں مدد دیں یا نہ دیں۔"
میرا یہ جواب سُنکر سروپانند کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بولے سہی اپنا ایک علیحدہ رسالہ نکالنے پر
غور کرنا ہو گا۔ مَیں نے کہا بے شک نکال لیں۔ لیکن مَیں کسی کے ہاتھ میں ٹول (TOOL) نہیں بن سکتا
مَیں غصّہ سے بھرا ہوا وہاں سے اُٹھا۔ اور سوامی شیوانند کے پاس پہنچا اُنھیں اپنی اور سروپانند
کی بات چیت سُنائی وہ مُسکرا کر بولے۔

"MR, KHUSHDIL, I CAN NOT DO ANY THING.
YOU WILL HAVE TO WORK ACCORDING TO THE

INSTRUCTIONS OF SAWAMI SARUPA NAND."

میں چلا آیا۔ "THIS IS IMPOSSIBLE." یہ ناممکن ہے۔

اس کے بعد جو کچھ میرے منہ میں آیا۔ مَیں نے کہا لیکن سوامی جی خاموش رہے مَیں نے محسوس کیا کہ سوامی سروپانند جو کالونی یہاں بنانا چاہتے ہیں وہ سوامی شیوانند کے مشورہ اور تعاون کے بغیر کیسے بنا سکتے ہیں اسلئے دھرم پرچار کی جگہ یہ اپنا ہی گورو ڈم پھیلانا چاہتے ہیں ان سے بحث کرنا فضول ہے چنانچہ میں چلا آیا۔ اگلے دن ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈیوائن لائف سوسائٹی کی میٹنگ میں یہ طے کر دیا گیا کہ ایک رسالہ ڈیوائن لائف نام سے انگریزی اور ہندی میں جاری کر دیا جائے چنانچہ جو روپیہ رسالہ سنکیرتن کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا وہ ڈیوائن لائف رسالہ کے لئے رکھ لیا گیا۔ اور مجھے ایک پیسہ کی مدد نہ دی گئی۔ مَیں نے جیسے تیسے ہوا "سنکیرتن" ایک سال تک چلایا۔ لیکن آخر کار اسے بند کرنا پڑا۔ ڈیوائن لائف رسالہ کا دفتر بھی پہلے پہل گوالمنڈی لاہور میں کھولا گیا اور اسکے لئے کافی روپیہ اکٹھا کر لیا گیا چند ماہ بعد ایسا واقعہ ہوا جس سے میرے دل میں سوامی شیوانند کے متعلق شردھا بھی ختم ہو گئی۔ سوامی شیوانند کے نام سے لاہور کے روزانہ اردو اخبار "پرتاپ" جنم اشٹمی ایڈیشنوں میں ایک اشتہار نکلا جس کا عنوان تھا "کویراج اور کرشن" اس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔ کہ کویراج ہرنام داس میں کہاں اتنی شکتی تھی کہ وہ "ہدایت نامہ خاوند" تحریر کرتے یہ تو بھگوان کرشن نے خود اُن کے دل میں بیٹھکر ایسی کتاب لکھوائی ہے۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے بہت مفید ہے اور اس کا مطالعہ ان کو ضرور کرنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ

مَیں نے اشتہار کا وہ کٹنگ اور ایک غصے سے بھرا ہوا خط سوامی شیوانند کو لکھا۔ اُن کا جواب آیا کہ اُنہوں نے کتاب ہدایت نامہ نہیں پڑھی۔ اشتہار کا مضمون سوامی سروپانند نے بنا کر اس پر دستخط کروائے تھے اسلئے مَیں سوامی سروپانند سے ملوں۔ مَیں سوامی سروپانند سے ملا اور اُسے کافی لعن طعن کی جس سے وہ بہت بگڑے لیکن یہ تھے اُنکے زوال کا آغاز ہو چکا تھا۔

اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد حالات کچھ ایسی نازک صورت اختیار کر گئے کہ سوامی شیوانند کو اُسے اپنی سوسائٹی سے علیحدہ کرنا پڑا۔ اسکے بعد بھی میں کئی دفعہ سوامی شیوانند سے ملا لیکن میرے دلمیں اُن کے متعلق احترام کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ سب ختم ہو چکے تھے اور میرے دل پر یہ اچھی طرح نقش ہو گیا تھا کہ یہ بھی نام اور شہرت کے بھوکے ہیں اور روحانیت کی آڑ میں اپنا گورو ڈم پھیلا رہے ہیں۔

آخری بار سوامی شوانند سے مَیں سنہ ۱۹۶۴ء میں اپنے ایک مہربان شری لبھ شنکر ناتھ اگروال کے ساتھ ملا۔ اُس وقت وہ بیمار تھے اور چلنے پھرنے میں بہت دقت محسوس کرتے تھے۔ مَیں تقریباً چودہ پندرہ سالوں کے بعد اُن سے ملا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور پوچھنے لگے "آجکل کہاں رہتے ہو اور کیا کام کرتے ہو"۔ مَیں نے عرض کی کہ دہرہ دُون میں رہتا ہوں اور اپنا ایک ہفتہ وار اخبار "دیش سیوک" نکالتا ہوں۔ بولے اتنے سالوں سے دہرہ دُون میں رہ رہے ہو اور کبھی ملے بھی نہیں۔ مَیں نے جواب دیا۔ "سوامی جی! نہ تو ملنے کی خواہش پیدا ہوئی اور نہ ضرورت محسوس کی۔ اسلئے نہ ملا۔ سوامی جی اپنے سیوکوں اور بھگتوں کے سامنے میرا یہ جواب سُنکر کچھ گھبرائے تو ضرور لیکن پھر فوراً سنبھل کر اپنے سامنے بیٹھے چند یورپین لوگوں سے انگریزی میں میری اور میری شاعری کی تعریف کرنے لگے۔ بعد ازاں سوامی جی نے مجھے اور میرے ساتھی کو کافی پلائی اور کاجو وغیرہ کھلائے۔

یہ تھی میری اُن سے آخری مُلاقات۔ اسکے بعد اُن کا دیہانت ہو گیا۔

بھگوان پیسہ ہو گیا

ہر بڑے چھوٹے کا اب ارمان پیسہ ہو گیا
دھرم پیسہ ہو گیا۔ ایمان پیسہ ہو گیا
مندروں میں گورودواروں میں بھی ہے پیسہ کا شور
آج کے ہندو کا تو بھگوان پیسہ ہو گیا

بابا ساون سنگھ

مَیں لاہور چھاؤنی میں جس مکان میں رہتا تھا۔ اُسی مکان کے ایک حصّہ میں لوکو ورکشاپ لاہور کا ایک مستری شری بال مکند اپنے بال بچوں کے ساتھ رہائش رکھتا تھا۔ وہ مستری اور اُس کی بیوی بابا ساون سنگھ بیاس والے کے مُرید تھے اور اکثر اوقات اپنے گُرو کے ست سنگ میں جایا کرتے تھے۔ مجھے وہ اپنے گُرو کے متعلق ایسے ایسے قصّے سنایا کرتے تھے جن کو میرا دماغ صحیح ماننے سے انکار کر دیتا مثلاً وہ کہتے تھے کہ ہمارے گُرو کے سامنے کوئی آدمی اپنی زبان نہیں کھول سکتا۔ کوئی اُن کا فوٹو نہیں لے سکتا (اس وقت تک اُن کا کوئی فوٹو نہ لیا گیا تھا) اگرچہ بعد ازاں اُن کے فوٹو بازاروں میں بھی بکے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر کوئی فوٹو لینے کی کوشش کرے گا تو وہ اندھا ہو جائے گا۔ ایسی باتوں کے علاوہ وہ اُنکی روحانیت کے بھی کئی کارنامے بیان کرتے کہ جن کو میرے دل و دماغ درست تسلیم نہ کرتے تھے چنانچہ مَیں نے بابا ساون سنگھ سے ملنے اور اُن کے معجزوں کی بابت کچھ جاننے کا دل میں ارادہ کر لیا۔

سنہ ۱۹۳۸ء کے شروع میں مَیں اپنے دوست شری شیام لال کے ساتھ ایک دن بیاس پہنچ گیا۔ ست سنگ کے سکریٹری سے ملا اور انھیں بتایا کہ مَیں بابا جی سے ملنے آیا ہوں وہ بولا۔ "مہاراج جی ابھی ابھی سرسہ سے واپس آئے ہیں اور بہت تھکے ہوئے ہیں اسلئے آج ملاقات نہ ہو سکے گی۔ آپ آج رات یہاں رہیں کل ست سنگ کے بعد آپکو ملاقات کا وقت مِل جائیگا۔

مَیں نے سکریٹری کو اپنا وزیٹنگ کارڈ (VISITING CARD) دیتے ہوئے کہا کہ آپ بابا جی کو میرا یہ کارڈ دیدیں پھر ملاقات کے لئے جو وہ وقت دیں اگر مجھے بتا دیں۔

کل کے لئے ملاقات کا وقت مقرر ہوئے بنا میں یہاں رات نہ ٹھہر سکوں گا۔ کیا پتہ کل بھی اُنکو وقت ملتا ہے یا نہیں؟ آپ جا کر اُن کو میری بابت ابھی بتا دیں،،

سکریٹری صاحب نے مجھے کچھ گھور کر دیکھا پھر بادل ناخواستہ میرا کارڈ لیکر اس مکان کی جانب چلے گئے جہاں بابا جی آرام کر رہے تھے چند منٹ کے بعد واپس آکر بولے:۔

"آپ کو ابھی مہاراج جی نے بُلایا ہے چلئے"۔ مَیں نے انکی طرف مسکراہٹ سے دیکھا اور اپنے دوست کے ساتھ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ایک کمرے میں ایک تخت پوش پر بابا ساون سنگھ جی بیٹھے تھے۔ ہم دونوں نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی اور پاس بچھی ہوئی ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ سکریٹری صاحب چلے گئے۔ اور اُن کے جاتے ہی بابا جی میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہئے "کیسے کشٹ کیا"؟ کافی مدت سے آپکا نام سن رہا تھا میرے پڑوس میں ایک مستری رہتا ہے جو آپ کا بہت بھگت ہے اُس سے کئی بار آپکے متعلق باتیں ہوئیں جس سے آپ سے ملنے کا اشتیاق بڑھا۔ چنانچہ آج وقت ملا تو یہاں چلا آیا۔" یہ کون ہیں؟" یہ میرے دلی دوست اور سچے غمخوار ہیں اور دھارمک رسالہ سنکیرتن مَیں انکی ہی مدد سے نکال رہا ہوں۔ یہ اُسکے مینجر ہیں۔ اُس کے بعد چند منٹ تک رسمی بات چیت ہوتی رہی پھر یکایک بول اُٹھے۔ کوئی خاص بات اگر آپ کو پوچھنی ہو تو پوچھیں؟ مَیں نے کہا یہ بتائیں کہ جو طریقہ دھیان یوگ یا سُرت کے ابھیاس کا آپ بتاتے ہیں وہ پرانا ہے یا نیا؟ طریقہ تو پرانا ہے لیکن یہ کسی گرنتھ یا شاستر میں نہیں لکھا گیا۔ سینہ بہ سینہ یہ راز چلا آتا تھا۔ اب (نہ جانے انہوں نے کس کا نام لیا۔ مجھے یاد نہیں رہا) پنڈت تو شیودیال صاحب نے لوگوں کی بھلائی کے لئے اُسے لوگوں پر ظاہر کرنے کا آدیش دیا ہے چنانچہ یہی سُرت شبد یوگ کا طریقہ مَیں لوگوں کو بتاتا ہوں۔

میرا دوسرا سوال تھا کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپکے بتلائے ہوئے طریقہ پر عمل کرکے آدمی آتم ساکھشات کار کر سکتا ہے وہ بولے۔ چھ ماہ میرے کہنے کے مطابق ابھیاس کرو۔

پھر آپکو خود بخود پتہ چل جائیگا کہ طریقہ غلط ہے یا صحیح ۔ مَیں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا ۔
" جناب ہمارے دیش میں آجکل اسقدر گُرو ڈم پھیلا ہوا ہے کہ ہر گُرو اپنے آپ کو خدا یا اُس کا نائب سمجھتا یا کہتا ہے ۔ اب بتلایئے میری جیسی سادھارن بُدھی کا ایک شخص کیسے یہ جان سکتا ہے کہ فلاں گُرو کامل ہے اور اسکے کہنے کے مُطابق چلکر مَن کو یکسوئی حاصل ہو سکتی ہے تو پھر تم کیا چاہتے ہو کس طرح تمہاری تسلی ہو سکتی ہے ؟ اُنہوں نے گمبھیر آواز میں پوچھا ۔ میں نے ذرا بلند آواز میں کہا " دیکھئے مَیں ہارمونیم باجہ بجانا بجا لیتا ہوں ۔ میرے پاس جو شخص باجہ سیکھنے کے لئے آتا ہے مَیں پہلے اُسے باجہ بجا کر دکھاتا ہوں اور پھر اُسے کہتا ہوں کہ چھ سات ماہ میں تم چھوٹے موٹے بھجن خود بجا لیا کرو گے اور اگر ایک سال تک روزانہ پریکٹس کر لو گے تو میری طرح دونوں ہاتھوں سے باجہ بجا سکو گے اور ہر ایک ٹیون (TUNE) نکال لیا کرو گے ۔"
مَیں نے باباجی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور پُر زور الفاظ میں کہا ۔ " دیکھئے آپ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی روحانی شکتی سے مجھے سمادھی لگوا دیں یا کسی نور کی ایک جھلک ہی دکھا دیں ۔ مَیں چھ ماہ تو کیا چھ سال تک یہاں رہ کر آپکے بتلائے ہوئے طریقہ کے مُطابق ابھیاس کرتا رہوں گا ۔ وہ بولے ایسا تو نہیں ہو سکتا ۔ مَیں نے کہا تو مَیں بھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ چھ ماہ تک روزانہ دو تین گھنٹے رادھا سوامی کا جاپ کرتا رہوں اور اپنی دماغی خشکی میں اضافہ کر لوں " وہ ہنسے کہنے لگے ۔ اس کام میں تو اندھ وشواس کی ضرورت ہے ۔ بنا وشواس کے کامیابی ممکن نہیں لیکن اس بات کا کیسے وشواس ہو کہ مَیں ٹھیک طریقے کے مُطابق ابھیاس کر رہا ہوں " یہ چیز تو ست سنگ سے ہی ملے گی ۔ آپ کچھ دن یہاں رہیئے ۔ اور ہمارے ست سنگ میں شامل ہوتے رہیں "
مَیں نے کل کے ست سنگ میں شامل ہونیکا وعدہ کر لیا اور ہم دونوں باباجی کے کمرے سے باہر آ گئے میری اور میرے دوست کی رہائش وغیرہ کا اچھا انتظام کر دیا گیا ۔
اگلے دن جب ہم دونوں دوست دریائے بیاس سے نہا کر واپس آئے تو ست سنگ شروع ہو چکا تھا چنانچہ ہم کمرے میں جانے کی بجائے سیدھے ست سنگ کی طرف چلے گئے ۔

جوں ہی ہم آگے بڑھے ایک شخص نے ہمیں ٹوکا اور کہا کہ ننگے سر مت جاؤ۔ شیام لال نے رومال نکال کر سر پر رکھ لیا لیکن میں اڑ گیا۔ اگرچہ میری جیب میں بھی رومال پڑا تھا۔ لیکن مجھے یہ بندش بہت اکھری۔ (میں ان دنوں ننگے سر ہی رہا کرتا تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تب سے لیکر ۱۹۶۰ء تک ننگے سر رہا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ٹوپی پہننی شروع کی۔ وہ بھی کبھی کبھی) میں نے اس سیوادار سے کہا میں یہیں کھڑا کھڑا ست سنگ سن لوں گا آگے نہیں جاتا۔ بابا جی نے ہماری طرف دیکھا تو بلند آواز سے کہا کہ ان کو آنے دو اور آگے لاکر بٹھا دو چنانچہ ہم دونوں کو وہ سیوک ست سنگ کی سب سے اگلی لائن میں لے گیا۔ اور وہاں ہم بیٹھ گئے۔ ان کے ست سنگ کا طریقہ یہ تھا۔ بابا جی ایک تخت پر براجمان تھے۔ برف کی مانند سفید داڑھی چہرے پر سادگی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک اچھی پرکشش شخصیت تھی اُنکی۔ دائیں بائیں دو سردار صاحبان بیٹھے تھے جو نہایت خوش الحانی سے 'شبد' پڑھ رہے تھے اور بابا جی اس کا مطلب بیان کرتے جاتے تھے۔ دونوں شبد پڑھنے والوں کے گلے بہت سریلے تھے۔ اور وہ کافی بلند آواز سے گاتے تھے۔ اُس دن کے ست سنگ کا موضوع تھا۔ "گورو مہما" چنانچہ مختلف نامی سادھوؤں مثلاً کبیر اور سورداس اور دیگر مشہور بھگتوں کے دوہے پڑھے جا رہے تھے۔ جن کا مفہوم یہ تھا کہ گرو کے بنا گتی نہیں ہو سکتی اور گورو کا درجہ بھگوان سے بھی بڑا ہے ایک گھنٹہ کے قریب ست سنگ ہوتا رہا۔ خاتمہ پر بابا جی نے کہا کسی کو کوئی شنکا ہو تو پوچھ سکتا ہے میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے پوچھا آپنے گورو کی مہما تو بتا دی کہ وہ بھگوان سے بھی بڑا ہے اور اُس کے بغیر روحانی ترقی نہیں ہو سکتی۔ لیکن آجکل چاروں طرف گورو ڈم اور پاکھنڈ اسقدر پھیلا ہوا ہے کہ چالاک لوگ اپنے آپکو کامل گورو ظاہر کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور بھگوان کی عبادت کی بجائے اپنی بھگتی کا پرچار کر رہے ہیں یہ بتائیے کہ کامل اور سچے گورو کی پہچان کیا ہے؟ کیونکہ جو لوگ گورو ڈم پھیلا رہے ہیں وہ یقیناً عام سادھارن آدمیوں سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ہیں اسلئے آپ گورو کی پہچان کا کوئی صحیح طریقہ بتائیں۔

باباجی نے کہا ہمارے شاستروں میں لکھا ہے کہ جیسے ایک سر سبز اور گھنی شاخوں والے درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہونے یا بیٹھنے سے مسافر کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اسی طرح جس گورو کے پاس جا کر تمہیں دلی سکون ملے اور تمہارے من پر یہ پربھاؤ پڑے کہ یہ عظیم روحانی طاقت کا مالک ہے اُسے ہی سچا گرو ماننا چاہیئے۔"

مَیں نے اسکے بعد اور کچھ نہ پوچھا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ست سنگ ختم ہو گیا۔ تو مَیں نے شیام لال سے پوچھا۔"کیوں دوست تمہارا دل کیا کہتا ہے؟ کیا تم باباجی کو اپنا گرو بنانا چاہتے ہو۔ وہ بولا "نہیں"۔ مَیں بولا میرے دل پر بھی ان کی روحانیت کا کوئی پربھاؤ نہیں پڑا۔ اسلئے یہاں مزید رہنے سے کیا فائدہ؟ شیام لال نے پوچھا تو کیا ارادہ ہے؟ مَیں نے کہا کہ باباجی کو دیکھنا تھا دیکھ لیا ان کا ست سنگ بھی سُن لیا۔ اب گھر چلتے ہیں چنانچہ ہم دونوں اُٹھ آئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہمیں ایک ایسے انگریز یا امریکن سے ملایا گیا۔ جو وہیں قیام رکھتا تھا شاید اُس نے اپنا ہندوستانی نام پریم سنگھ رکھ لیا تھا اُس نے چند منٹ تک کافی کنویسنگ CONVESSING کی اور بتایا کہ وہ سارا بھارت ورش گھوم کر دیکھ چکا ہے باباجی سے بڑھ کر اُسے کوئی دوسرا یوگی نہیں ملا۔"

مَیں نے کہا آپ اتر کاشی کی طرف جائیں وہاں دو تین ایسے یوگی ہیں جو نروکلپ سمادھی لگاتے ہیں۔ رشی کیش میں بھی آپ..... پنتو بن سوامی اور مہاتما اودھوت سے ملیں پنتو بن سے اوپر بھی ایک مہاتما مونی بابا رہتے ہیں جنھوں نے بارہ سال سے اناج نہیں کھایا اور جو بالکل مون رہتے ہیں خیر چند منٹ کی بات چیت کے بعد ہم دونوں اپنے کمرے میں آگئے اور اُسی دن واپس لاہور چھاؤنی پہنچ گئے۔ چند دن کے بعد باباساون سنگھ جی کا ایک خط مجھے ملا جسے مَیں نے اپنے رسالہ سنکیرتن کے ماہ اپریل ۱۹۳۸ء کے پرچے میں شائع کر دیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

مکرم بندہ جناب پنڈت خوشدل صاحب

مَیں نے آپکے اعتراض و متاعدہ پڑھے جن کے ساتھ میری پوری ہمدردی ہے جو

مقاصد آپ نے تحریر کئے ہیں اُن کی دُنیا کو اشد ضرورت ہے میرا بھی یہی مشن ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے ڈیرا کے انتظام اور ست سنگ کی سیوا سے اسقدر فرصت نہیں کہ مَیں اپنی توجہ مضمون نویسی کی طرف دوں۔ مَیں آپ کے رسالے کا حامی ہوں مگر اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ پرمارتھ پرکار بند رہنا چاہیئے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مُقدس مقامات میں پھر کر دیکھا ہے۔ مذہبوں کی کشمکش فرقہ واری کا تعصب اور پکش پات جا بجا ظہور پذیر ہے۔ اصل پرمارتھ مذہبی تعصبات سے مبرا ہونا چاہیئے جس کو تمام لوگ پریم اور پیار سے منظور کریں جب آپ اچھی طرح سے وحدانیت کو اپنے اخبار کا مشن بنا دیں گے اور مذہبی تعصب سے اُسے پاک رکھیں گے تو دُنیا خود بخود اس کی قدر کرے گی۔

آپ کا خیر اندیش

ساون سنگھ

قطعہ

در حقیقت ہم حقیقت کو سمجھنے کس طرح
جو حقیقت تھی اُسے وہم و گماں کہتے رہے
جو خدا کو بھول کر پیسے کے بندے بن گئے
ہم اُنہیں کو کامیاب و کامراں کہتے رہے
واقفِ منزل نہ تھا جو راہ سے تھا بے خبر
ہم سبھی اُس کو امیرِ کارواں کہتے رہے

پنڈت مکند مالویہ

۱۹۴۲ء میں مہامنہ پنڈت مدن موہن مالوی جی کے ایک لڑکے پنڈت مکند مالوی
سے میرا تعارف ہردوار میں ہوا ۔ یہ ان دنوں پنجاب ۔ سندھ چھیتر ۔ بھیم گوڈا روڈ ۔
ہردوار میں دو تین ہفتوں کا اکھنڈ کیرتن کروا رہے تھے ۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے میری
بھی مدد مانگی اور میں نے بھی چند دن پنجاب سندھ چھیتر میں رہ کر کیرتن کے متعلق انتظامات
کی دیکھ بھال کرنا منظور کر لیا ۔ کیرتن کو چوبیس گھنٹوں تک جاری رکھنے کے لئے میں مختلف
اشخاص کی دو ۔ دو اور تین تین گھنٹوں کی ڈیوٹیاں لگا دیتا تھا اور خود بھی کئی بار
مندر میں جا کر یہ دیکھا کرتا تھا کہ جس شخص کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے وہ اپنا فرض بخوبی
سرانجام دے رہا ہے یا نہیں ۔

میرا خیال تھا کہ پنڈت مکند مالوی ایک نامور اور کٹر دھارمک باپ کا بیٹا ہے
اسلیئے وہ بھی ہر لحاظ سے ایک بہتر انسان ہو گا ۔ اور اُس کے دل میں بھگوان کے کیرتن
کے لیئے سچا پریم ہو گا ۔ لیکن ایک رات کو جب ان کی رضامندی سے میں نے اُن کی ڈیوٹی
کیرتن کرنے کی لگائی تو وقت مقررہ پر آدھی رات کے بعد میں نے اُن کو جگا دیا اور کیرتن
کے لئے مندر میں جانے کے لئے کہا وہ اُٹھے ۔ منہ ہاتھ دھویا اور دھوتی پہن کر مندر کی طرف
چل دیئے ۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا ۔ اُس دن اگرچہ دن بھر
کا بہت تھکا ہوا تھا لیکن مجھے نیند نہ آئی چنانچہ میں بستر سے اُٹھا اور مندر کی طرف
چل دیا ۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ کہ پنڈت مکند مالوی وہاں بھگوان کی مورتی کے سامنے

خراٹے لے رہے ہیں۔ میں نے انھیں جھنجوڑ کر جگایا تو وہ سخت شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے
"خوشدل۔ آج دن بھر کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی اسلیئے نیند نے غلبہ پا لیا
آپ یہ کسی سے مت کہنا کہ مکند مالوی اپنی ڈیوٹی کے وقت سو گیا تھا" میں خاموش رہا
انہوں نے کہا کہ آپ جا کر آرام کریں۔ اب میں ہرگز نہ سوؤنگا۔ میں چلا آیا لیکن میرے
دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی اسلیئے کوشش کرنے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی۔ نہ جانے میرے
دل میں کیا خیال آیا کہ میں آدھ گھنٹہ کے بعد پھر مندر میں پہنچ گیا۔ دیکھا تو وہی پہلے والی
حالت۔ پنڈت مکند مالوی دین و دنیا سے بے خبر خواب راحت کے مزے لوٹ رہے تھے۔
اور بھگوان کی مورتی کے آگے جوت بھی نہیں جل رہی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن اس
خیال سے چپ رہا کہ میں نے اگر اونچی آواز میں پنڈت مکند مالوی کو سخت سست کہا
تو ساتھ والے کمرے میں سویا ہوا مندر کا پجاری جاگ اٹھے گا۔ چنانچہ شانوں سے پکڑ کر
پنڈت جی کو جھنجوڑا۔ آنکھیں ملتے ہوئے وہ پھر اٹھے۔ اور میری جانب شرمسار نگاہوں سے
دیکھنے لگے۔ میں نے کہا کہ آپ جائیں اور کسی دوسرے کو کیرتن کرنے کے لئے بھیجدیں تب تک
میں یہاں مہامنتر "ہرے رام ہرے رام رام رام ہرے ہرے۔ ہرے کرشن ہرے کرشن
کرشن کرشن ہرے ہرے۔" (اس منتر کو مہا منتر کہتے ہیں اور اکثر اس منتر کا جاپ
اکھنڈ کیرتن میں کیا جاتا ہے) کا جاپ کرتا رہوں گا۔ چنانچہ مکند مالوی جی چلے گئے۔
اور ان کی بجائے میں نے ڈیوٹی سنبھال لی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد جب ایک برہمچاری نے
آکر میری جگہ لے لی۔ تو میں اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ صبح سویرے اٹھتے ہی میں نے پنڈت
مکند مالوی سے کہا کہ میں آج رشی کیش چلا جاؤں گا اور جب آپکے کیرتن کا بھوگ پڑے گا۔
تب اس موقع پر حاضر ہو جاؤں گا۔ انہوں نے بہتیرا مجھے وہاں روکنے کی کوشش کی
لیکن میں واپس رشی کیش چلا گیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہی پنڈت جی جب کیرتن کے متعلق بھاشن دیا کرتے تھے تو کہا

کرتے تھے کہ جس شخص کو بھگوان کا کیرتن کرتے ہوئے نیند آجائے۔ تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ بہت بد قسمت ہے اور اُس کا من شُدھ نہیں۔

اکھنڈ کیرتن کے خاتمہ کے بعد بھی پنڈت مکند مالوی سے میری چند ملاقاتیں ہوئیں۔ اور مجھے پکا یقین ہو گیا۔ کہ نہ تو ان کے دل میں بھگوان کے لئے کچھ پریم ہے اور نہ ہی اپنی جاتی یا دیش کے لوگوں کے لئے بے غرض خدمت کرنے کا کوئی جذبہ۔ بلکہ وہ دھرم اور بھگوان کے نام پر روپیہ کمانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے ہر کی پوڑی کے سامنے بر لب سڑک واقع ڈاٹ والی حویلی کا ٹھیکہ بھی لے لیا تھا اور اس سلسلے میں ایک لمبی چوڑی اسکیم بھی بنائی تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی اُنھیں وہ ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا اور ہردوار چھوڑ کر چلے جانا پڑا۔

بھگوان بن بیٹھے

وطن کی آن بن بیٹھے وطن کی شان بن بیٹھے
جو بے غیرت ہیں، بے حِس ہیں، وطن کی جان بن بیٹھے
جو اپنے دھرم اور ایمان پر سب کچھ لُٹاتے تھے
وہی دولت کی خاطر آج بے ایمان بن بیٹھے
شرارت جن کی رگ رگ میں ہے اور دل میں کدورت ہے
وہ دَورِ حاضرہ کے محترم انسان بن بیٹھے
خدا کا قہر بن کر بجلیاں بھارت پہ ٹوٹے گا
یہاں جتنے بھی تھے شیطان وہ بھگوان بن بیٹھے

نارائن سوامی

سنہ ۱۹۴۱ء یا سنہ ۱۹۴۲ء میں ایک بڑا بھاری یگیہ ہوا۔ اُس یگیہ کے لئے دلتے بہادر رام شرن داس کی دھرم پتنی نے نصف لاکھ کے قریب روپیہ صرف کیا۔ اُس یگیہ کا انتظام گوسوامی گنیش دت نے کیا۔ مَیں بھی ایک دن یگیہ منڈپ میں گیا تو دیکھا کہ اُتراکھنڈ کے مشہور اور تپسوی بوڑھے مہاتماؤں مثلاً تپوبن جی وغیرہ کی موجودگی میں ایک ایسے نوجوان سادھو کو یگیہ پتی بناکر سب سے اونچے آسن پر بٹھا دیا گیا تھا جو نہ تو گیروے کپڑے پہنے تھا اور نہ ہی جس کے بھاشن میں کوئی اثر تھا۔ اُس دن کے بھجنوں اور لیکچروں کا پروگرام جب ختم ہو گیا تو مَیں نے گوسوامی جی سے اُس نوجوان یگیہ پتی کے بارے میں دریافت کیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ یہ بڑا وِدوان سادھو ہے اور اس کا نام نارائن سوامی ہے۔ ہردوار مہابیرؔ دل کے انچارج پنڈت چرنجیو لال اور مہابیر دل کے ایک کتھاواچک جگدیش چندر نے بھی اُس سادھو کے متعلق حیرت انگیز اور عجیب غریب باتیں بتائیں۔ چنانچہ میرا اشتیاق بڑھا اور مَیں نے اس سادھو کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اِسی ارادے کو لیکر مَیں اُس کے ٹینٹ (TENT) یعنی خیمے میں جا پہنچا۔ دیکھا بھاری ڈیل ڈول۔ رنگ سانولا۔ چوڑا ماتھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور سر پر گھونگرالے بال بہت اچھی بارعب شخصیت کا وہ نوجوان سادھو پلنگ پر لیٹا تھا۔ اور سامنے چٹائی پر چار پانچ مارواڑی یا گجراتی مرد عورتیں بڑی شردھا سے بیٹھی ہوئی تھیں مَیں نے جب نمسکار کیا تو فوراً اُٹھ بیٹھے اور ہاتھ سے پکڑ کر اپنی چارپائی پر بٹھایا۔ پوچھا سگرٹ پیتے ہو؟ ”پیتا ہوں اور خوب پیتا ہوں“۔ مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا سوامی جی نے اپنے سرہانے کے نیچے سے ۵۵۵ کا

کاڈبہ نکالا۔ اور میری طرف بڑھا دیا۔ مَیں نے ایک سگرٹ نکالا۔ اور سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔
یکایک نارائن سوامی نے پھر پوچھا" کچھ اپنا پریچے دو"۔ مَیں نے عرض کی میرا نام پنڈت خوشدل ہے
پہلے لاہور سے اخبار نکالتا تھا۔ آجکل رشی کیش میں رہتا ہوں۔ اور ایک چھوٹی سی فارمیسی
کھولی ہوئی ہے جس کے سہارے دال روٹی کا گزارہ چل جاتا ہے"۔ سوال کیا" شادی شدہ ہو"
" جی ہاں"۔ مَیں نے جواب دیا۔ ایک نہیں بلکہ دو شادیاں کر رکھی ہیں اور دونوں زندہ ہیں۔
بولے۔ ایسا کیوں کیا۔ مَیں نے کہا اس کی وجہ پھر کبھی بتاؤں گا چنانچہ سوامی جی مجھ سے بات
چیت بند کر کے اپنے ایک بھگت سے گجراتی یا مارواڑی زبان میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ دوران
گفتگو اُن کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ نکلے کہ جن کو سُنکر مَیں حیران رہ گیا۔ چونکہ اُن سے میری
پہلی مُلاقات تھی۔ اس لیئے مَیں نے اُن کی گفتگو کے طریقے پر اعتراض کرنا مناسب سمجھا اور کچھ دیر کے
بعد اپنے گھر چلا آیا۔ یگیہ کے دوران چار پانچ مرتبہ نارائن سوامی سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا اور مَیں نے
یہ اندازہ لگا لیا۔ کہ سنسکرت کے ایک اچھے ودوان ہونیکے علاوہ ان کو انگریزی۔ ہندی اور
اردو ادب سے بھی کافی لگاؤ ہے۔ سنگیت اور شعر و شاعری کا بھی اُن کو کافی شوق تھا چنانچہ ہم
دونوں آپس میں کافی کھُل گئے۔ اور یہ مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھنے لگے۔ جب کبھی نارائن سوامی
سے پاکھنڈی سادھوؤں کے متعلق بات چلی تو انہوں نے میرے خیالات کی تائید کی اور کہا کہ اسی لیئے
مَیں نے دھرم اُپدیش دینے اور دھارمک کتھائیں کرنی ترک کر دی ہیں۔ مَیں تو مارواڑی سیٹھوں
کو اناج اور دیگر اشیاء کے بھاؤ کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق بتاتا ہوں اور اُن سے اپنا حصّہ لیتا ہوں"۔
مَیں جب رشی کیش کو چھوڑ کر ہردوار چلا گیا۔ تو وہاں بھی ایک دو بار نارائن سوامی سے
میری مُلاقات ہوئی لیکن دہرہ دون آکر تو مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ٹیلی فون
ایکسچینج کے سامنے ایک بلڈنگ میں رہتے تھے اور اکثر اوقات ہم دونوں آپس میں ملکر ملکی حالات
پر باتیں کیا کرتے تھے چند مہینوں کے بعد مَیں نے محسوس کیا کہ اُن کے قول و فعل میں کوئی یکسانیت
نہیں۔ اور اُن کی زندگی کا واحد مقصد عیش کرنا اور امیر اشخاص سے روپیہ حاصل کرنا ہے۔

اُن کی زبان پر بھروسہ کرکے مَیں بھی کافی زیر بار ہوا۔ لیکن بہت جلد اُن کی اصلیت کا مجھے پتہ چل گیا۔ اور مَیں نے اُن سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ جس گھر میں یہ رہتے تھے اُس گھر کے مالکوں سے بھی اُن کی اَن بن ہو گئی۔ اور یہ مظفّر نگر چلے گئے۔

نہیں رہے

وہ ولولے وہ جوش وہ ارماں نہیں رہے
بھارت میں پہلے جیسے اب انساں نہیں رہے

اب لیڈروں کا ذکر کیا ہے سادھو سنت بھی
سیوا کے اور تیاگ کے خواہاں نہیں رہے

ایمان بیچ بیچ کر کھانے لگے ہیں لوگ
اخلاق کی بُلندی کے امکاں نہیں رہے

سب کو ہے مال و عیش کے ساحل کی آرزو
اب دل میں دیش بھگتی کے طوفاں نہیں رہے

جن رہبروں کی رہبری پہ ناز تھا ہمیں
وہ بھی وطن کے دِل سے نگہباں نہیں رہے

راجہ مہندر پرتاپ

بچپن سے ہی مَیں نے راجہ مہندر پرتاپ کے متعلق کافی کچھ پڑھا اور سُنا تھا اور میرے دِل میں اُن کے لئے بے حد احترام تھا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں پہلی بار اُن کے درشن ہوئے پہلی ملاقات پر ہی آپنے کہا۔ "مجھے آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے اسلئے آپ میرے ساتھ مِلکر کام کریں۔"

مَیں نے عرض کیا کہ آپ کے آئندہ پروگرام کا مجھے پتہ چلے تو کچھ فیصلہ کر سکوں۔

اُنہوں نے دو کتابیں مجھے دیں۔ ایک پریم دھرم کے متعلق اور دوسری ورلڈ فیڈریشن کے بارے میں۔ کہنے لگے "انھیں پڑھ لیں ان سے میرے آئندہ پروگرام کا پتہ چل جائیگا۔ مَیں نے دو تین دنوں تک پھر آنے کا وعدہ کیا۔ اور چلا آیا۔ اگلے دِن مَیں نے دونوں کتابیں پڑھیں لیکن مجھے دونوں میں سے ایک بھی کتاب ایسی نہ لگی کہ اُس میں لکھے ہوئے طریقے کو اپنی زندگی کا لکش مان سکوں۔ چنانچہ جب میں دوبارہ راجہ صاحب سے ملا۔ اور انہوں نے میرے ارادے کے متعلق پوچھا۔ تو مَیں نے کہا۔

"I DO NOT AGREE WITH YOUR RELIGIOUS AND POLITICAL VIEWS AT ALL BUT I HAVE A GREAT REGARD FOR YOUR PAST SACRIFICES."

یعنی آپکے دھارمک اور سیاسی خیالات سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی گذشتہ قربانیوں کے لئے میرے دل میں بہت احترام ہے وہ بولے "اچھا آپ کبھی کبھی ملتے تو رہا کریں۔ تبادلۂ خیالات ہوتا رہے گا۔

میں نے عرض کیا کہ یہ تو میں اپنی عزت افزائی سمجھوں گا جو آپ مجھے کبھی کبھی وقت دے دیا کریں گے۔ میں ضرور گاہے بگاہے حاضر ہوتا رہوں گا۔

کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ راجہ صاحب نے "دہلی پکڑو" کا پروگرام بنایا ہے اس سلسلے میں میں نے اُن کا ایک پبلک لیکچر بھی سُنا لیکن مجھے اُن کا یہ پروگرام قطعاً پسند نہ آیا۔ اور نہ ہی اسمیں کامیابی کی کوئی جھلک دکھائی دے سکی۔ ہزاروں روپیہ راجہ صاحب نے اس اسکیم کے پرچار پر خرچ کیا۔ کافی دیر کے بعد سُنا گیا۔ کہ ایک نواب غالباً نواب بھوپال نے اُنھیں یہ روپیہ دیا تھا خدا جانے یہ کہاں تک درست ہے؟ لیکن وہ اسکیم بُری طرح فیل ہو گئی اور جن لوگوں نے دہلی پہونچنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُن میں سے صرف چند اشخاص ہی پہنچے۔

دہلی سے واپس آکر راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا اور یہ کہا کہ لوگوں نے اُنھیں دھوکہ دیا ہے اور وہ وعدہ کرنے کے باوجود دہلی نہیں پہنچے۔

چنانچہ میں نے اپنے اخبار "دلیش سیوک" میں ایک کھُلی چٹھی راجہ مہندر پرتاپ کے نام لکھی جس میں اُن کو مشورہ دیا۔ کہ وہ سیاست کی دلدل سے الگ رہ کر اپنا سارا وقت اور روپیہ تعلیمی اور سوشل کاموں کی طرف لگائیں۔ کیونکہ اُن کے موجودہ سیاسی پروگراموں سے کوئی مُفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یہ خط میں نے ۱۵ جولائی ۱۹۵۴ء ($15\frac{7}{54}$) کے "دلیش سیوک" میں شائع کیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

راجہ مہندر پرتاپ کے نام کھُلی چٹھی

محترم راجہ جی! جے ہند

آپ نے عالم جوانی میں بھارت ماتا کی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے جو کچھ کیا ہے

وہ قابلِ تعریف ہے لیکن چند برسوں سے آپ جس پروگرام پر عمل کر رہے ہیں وہ نہ صرف ناقابلِ فہم ہے بلکہ اس سے آپ کی سابقہ شہرت پر بھی بُرا اثر پڑ رہا ہے۔

مجھے آپ سے کئی مرتبہ تبادلۂ خیالات کرنے کا موقعہ ملا ہے اور اکثر اوقات میں نے آپ کے موجودہ پروگرام کی خامیوں کی طرف آپکی توجہ دلائی ہے لیکن آپکے ارد گرد کچھ ایسے اشخاص جمع ہوئے ہیں جو آپ کو کسی وجہ سے صحیح مشورہ دینا تو کجا سچی بات نہیں کہہ سکتے نتیجہ سامنے ہے۔ گزشتہ پانچ چھ سالوں سے آپکا کوئی بھی کاریہ کرم موثر اور فائدہ مند ثابت نہیں ہوا۔

"دہلی پکڑو" کی تحریک میں آپکو جس ناکامی اور خفت کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اُس سے آپ کی آنکھیں کھُل جانی چاہئیں۔ آپنے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا ہوگا کہ بہت سے لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ اگر آپ کا موجودہ پروگرام دیش کے لئے واقعی مفید اور فائدہ مند ہوتا تو یقیناً چند سو مخلص اور دیش بھگت آدمیوں کا آپ جیسی شخصیت کو ملنا مشکل نہ تھا اسلئے جہاں آپنے دہلی پکڑو کی تحریک میں اپنی ہار اور ناکامی کو کھُلے الفاظ میں تسلیم کر لیا وہاں موجودہ پروگرام کے بارے میں بھی یہ مان لیں کہ وہ سراسر فضول ہے۔ بے اثر اور ناقابلِ عمل ہے۔

اس کھلی چٹھی کے ذریعہ میں آپ کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ آئندہ کے لئے پالیٹکس کو چھوڑ کر سوشل۔ تعلیمی۔ اور دھارمک کاموں پر اپنی ساری توجہ مبذول کر دیں۔ آج کی سیاست جھوٹ اور فریب کے سہارے چل رہی ہے۔ اور آپ جیسے سیدھے سادے اور سچے تیاگی کے لئے اسمیں حصّہ لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر آپ لوگوں کے اخلاق درست کرنے اور انھیں بُرائیوں سے دُور رہنے کی تلقین کرنے کے ساتھ "پریم دھرم" کے کام پر اپنی ساری شکتی لگا دیں تو یقیناً دُنیا اور دیش کا بھلا کر سکتے ہیں۔ اس وقت بھارت واسیوں میں سچائی۔ نڈرتا۔ ہمدردی اور پاکیزگی کے جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور میرے خیال کے مُطابق آپ اس کام کے لئے عین موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ میرے مشورے پر غور کرتے ہوئے اور اپنے سابقہ تجربات سے فائدہ اُٹھاتے

ہوئے آئندہ کے لئے پالیٹکس سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گے۔ اور مستقبل میں اپنی ساری توجہ سوشل۔ دھارمک۔ اخلاقی و روحانی کاموں پر لگا دیں گے۔ تاکہ ہمارے دیش سے گوروڈم توہم پرستی، خود غرضی اور ڈھونگ و پاکھنڈ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ باقی پھر کبھی

آپ کی سابقہ قربانیوں کا مداح ۔ لیکن آپکے موجودہ پروگرام سے بیزار

(پنڈت خوشدل)

میرے اُس کھلے خط کے جواب میں راجہ مہندر پرتاپ نے ایک خط مجھے بھیجا جس کو میں نے دیش سیوک میں تاریخ ۲۶ جولائی ۱۹۵۴ء $(\frac{7}{54}26)$ کو چھاپا۔ اس خط کو شائع کرتے وقت میں نے ایک نوٹ بھی لکھا تھا۔ عنوان تھا۔

"میں اس زمانے کا ہادی ہوں"

ایڈیٹر دیش سیوک کے نام خط میں راجہ مہندر پرتاپ کا دعویٰ۔ ان کے خط کے ضروری حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

جناب مہربان ایڈیٹر صاحب

اخبار "دیش سیوک" دہرہ دون

محبت! آپ کے کھلے خط کا جواب میں آپ کے ہی اخبار میں شائع کرانا چاہتا ہوں یہی مناسب ہے۔ جنھوں نے آپکا میرے نام کھلا خط پڑھا ہے۔ اُن کو میرا جواب بھی دیکھنے کو ملنا چاہئے اوّل تو میں آپ کے مشورے کے لئے تشکر پیش کرتا ہوں۔ آپنے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اخلاق چاہتا ہے کہ ہمدردی کے لئے شکریہ ادا کیا جائے۔

دوسرے میں ضرور کہوں گا کہ مشورہ ناتجربہ کاری پر مبنی ہے۔ آپ کو شائد یہ پتہ نہیں کہ ہر دینی رہنما نے سیاسی رہنمائی ہمیش کی۔ شری کرشن سفیر سیاسی بنے۔ راجہ بنے۔ فوج بنائی۔ لڑے۔ دشمنوں کو قتل بھی کیا۔ حضرت محمد صاحب نے فوج بنائی۔ اور جنگ کی حکومت

قائم کی۔ عیسیٰ مسیح نے اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ بھی کہا۔ اور خُدا کا بیٹا بھی۔ بھگوان بُدھ کی تعلیم کی بُنیاد پر مہاراجہ اشوک نے نظام شہنشاہیت تشکیل دیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ مَیں اس زمانے کا ہادی ہوں۔ تب مجھے سیاسی و اخلاقی اور اقتصادی تعلیم بھی دین کے ساتھ ساتھ دینی چاہیئے۔ آپ خود مجھے دین محبت کی تعلیم دینے کو کہتے ہیں تو آپ میری دینی رہنمائی کو مانتے ہیں۔ آپ کو جب دین پسند ہے تو میری کتاب کی تبلیغ میں لگ جائیے۔

آپکا خیر اندیش

مہندر پرتاپ

وہ خط پڑھ کر راجہ صاحب کی دماغی حالت پر مجھے شبہ ہونے لگا لیکن اس کے باوجود گاہے بگاہے اُن سے مُلاقات ہوتی رہی اور ملک کے سیاسی حالات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔

پریم دھرم بھی اُن کا نہ چل سکا میرا خیال ہے ضلع دہرہ دُون میں شاید دو درجن سے زائد ممبران پریم دھرم کے نہ ہوں گے۔ چندبار اُن کے ست سنگ میں مَیں بھی شامل ہوا بالکل پھیکا اور بے اثر پروگرام۔ کوئی نئی بات اسمیں نہیں سوائے اس بات کے کہ اس دھرم کے بانی راجہ مہندر پرتاپ ہیں۔ چند خوشامد پسند لوگ ان کے ارد گرد جمع رہتے ہیں جو سچی بات کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اور جو راجہ صاحب کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس شخص نے ملک کیلئے اتنی قربانی دی۔ اور تیس پینتیس سال تک غیر ممالک میں رہا وہ آج تک ایک درجن وفادار اور سچے پیروکار اپنے نہ بنا سکا۔ اُن کی سیاست اور اُن کے دھارمک خیالات سے اختلاف رکھتا ہوا بھی مَیں اُن کی سادگی، صاف دلی۔ اور حلیمی کا ضرور قائل ہوں۔ کیونکہ جب بھی یہ کسی سے ملیں گے۔ نہایت کھُلے دِل سے اور سیدھے ڈھنگ سے بات چیت کرتے ہیں لیکن افسوس اُن کے قریب جانے سے میرے دل میں اُن کے لئے وہ شردھا اور عزّت نہ رہی۔ جو اُس وقت موجود تھی۔ جب تک اُن کے درشن نہ ہوئے تھے چنانچہ اُن پر بھی یہ قول صادق آتا ہے نام کرے لیکن درشن چھوٹے ؟

سردار دیوان سنگھ مفتوں

ان کا نام تو کافی عرصہ سے سُنا تھا اور اخبار "ریاست" بھی کئی بار پڑھا تھا لیکن ان سے
ملاقات کا موقع ۱۹۴۰ء میں ملا۔ جب مَیں اپنی دوسری بیوی اور اس کے والدین کے
ساتھ بندرابن جا رہا تھا۔ اس کے بعد جب مَیں دہلی آکر پہاڑ گنج میں رہا تو سردار دیوان سنگھ
کے ہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کی مہمان نوازی اور دلچسپ باتوں سے مَیں ان دنوں کافی متاثر
ہُوا۔ حالات نے مجھے چار پانچ سالوں تک رشی کیش اور ہردوار میں رہنے پر مجبور کیا اور اس دوران
میں بھی سردار صاحب سے گاہے بگاہے خط و کتابت ہوتی رہی۔ ۱۹۴۸ء میں دہرہ دون آکر مَیں نے
ہفتہ وار اخبار "دیش سیوک" جاری کیا۔ اور آئندہ کے لئے اسی شہر میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔

دہرہ دون سے جب کسی کام کے لئے دہلی جانا پڑا تو مَیں یا تو سردار دیوان سنگھ کے پاس
ٹھہرا کرتا یا اگر کسی دوسری جگہ بھی قیام کرتا تو ان سے ملے بغیر واپس دہرہ دون نہ آتا۔

اپریل ۱۹۵۷ء کے آخری ہفتے میں مجھے دہلی ہائی کورٹ میں ایک مقدمے کے سلسلے میں پیش
ہونا تھا۔ یہ مقدمہ پنجاب جیولرز دہرہ دون کے مالکان کی طرف سے مجھ پر دائر کیا گیا تھا۔ فرم کے مالک
شری سوامی داس کی اپنے بیٹوں سے ان بن ہو گئی تھی۔ اور بیٹوں نے دُکان واقع راجپور روڈ اپنے
نام پر الاٹ کروا لی تھی۔ اور بھی ایک دو جھگڑے باپ بیٹوں میں چل رہے تھے جن کا مجھے کوئی علم نہ تھا
شری سوامی داس نے ایک اشتہار میرے اخبار "دیش سیوک" میں چھپوایا تھا جس کی بنا پر سوامی داس
کے لڑکوں نے دہرہ دون کے ایڈیشنل سیشنز جج کی عدالت میں ایک درخواست دی کہ مجھ پر توہینِ عدالت

کا مقدمہ چلایا جائے۔ عدالت کی طرف سے جاری شدہ نوٹس کے جواب میں جو صفائی میں نے پیش کی اُسے درست سمجھتے ہوئے فاضل جج نے میرے خلاف دی گئی درخواست خارج کر دی۔

شری گوردھن لال کا ایک بھائی دہلی میں بھی رہتا ہے جن کا نام گردھاری لال ہے جب گوردھن لال اور اس کے بھائیوں کو دہرہ دون میں مجھ پر مقدمہ بنانے میں کامیابی نہ ہوئی تو اُنہوں نے اپنے دہلی والے بھائی کی معرفت میرے خلاف دہلی ہائیکورٹ میں توہینِ عدالت میں مُقدمہ چلانے کی درخواست دیدی۔ ہائی کورٹ سے موصُول شُدہ نوٹس کی جوابدہی کرنے کے لئے مجھے دو یا تین بار دہلی جانا پڑا اور میں سردار دیوان سنگھ کے ہاں ہی ٹھہرا۔ اگرچہ مسٹر سوامی داس نے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ اگر اُس کے لڑکوں نے دیش سیوک میں شائع شُدہ اشتہار کی بنا پر مجھ پر کوئی مقدمہ چلایا تو وہ اُس مقدمہ کے تمام اخراجات برداشت کرے گا۔ لیکن سوامی داس نہ صرف اپنے وعدے سے مُکر گیا بلکہ اپنی چمڑی بچانے کے لئے اُس نے مجھے مُقدمہ میں پھنسانے کی بھی کوشش کی۔ کیونکہ میرے ساتھ اس کے خلاف بھی توہینِ عدالت کے الزام میں مُقدمہ چلانے کی درخواست شری گردھاری لال نے دے رکھی تھی۔ دہرہ دون میں تو میرے ایک مہربان اور دلی ہمدرد ایڈوکیٹ شری سوہن لال نے اس مُصیبت سے مجھے رہائی دلائی۔ اور دہلی میں سردار دیوان سنگھ کی مہربانی سے ایک ایسے ایڈوکیٹ (شری رام بھیجا لال ملک) مِل گئے جو بغیر فیس لیئے دہلی ہائیکورٹ میں میری طرف سے پیش ہوتے رہے توہینِ عدالت کا نوٹس جسٹس مسٹر فالشا کی عدالت سے جاری ہوا تھا اور جس دِن مَیں اُن کی عدالت میں اپنا جواب داخل کرکے واپس دفتر "ریاست" میں پہنچا تو سردار دیوان سنگھ اپنی ڈاک دیکھ رہے تھے میرے بیٹھتے ہی ایک لفافہ اُنہوں نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے پنڈت جی۔ یہ جوش صاحب کا خط ہے۔ ذرا اِسے پڑھئے۔ پھر ایک لمحہ رُک کر بولے۔ "مَیں ایمان سے کہتا ہوں کہ اس جیسا شاعر ہندوستان میں صدیوں تک پیدا نہ ہو سکے گا۔" مَیں نے کہا۔ "بے شک شاعری کے لحاظ سے جوش صاحب کا مُقام بہت بلند ہے لیکن اُنہوں نے پاکستان جاکر مُسلم لیگ کے دو قومون کے نظریہ کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اِس طرح میری رائے میں ہندوستان سے غداری کی ہے۔

میرا یہ کہنا تھا کہ سردار صاحب بھڑک اُٹھے۔ گرم ہو کر بولے۔ "صادق قسم۔ پنڈت جی کبھی کبھی آپ بہت گھٹیا قسم کی بات کرتے ہیں۔ جب جوشؔ صاحب نے دیکھا کہ ہندوستان میں رہ کر اُن کے بچوں کی زبان خراب ہو رہی ہے اور انھیں جمعرات کو برہسپت وار کہنا پڑتا ہے تو وہ اپنے بال بچوں سمیت پاکستان چلے گئے۔ اس میں غدّاری کی کونسی بات ہے؟"

مَیں نے عرض کیا کہ پنڈت نہرو۔ مولانا آزاد اور چند دیگر ہندوستانی لیڈروں نے جوشؔ صاحب کے ساتھ جو مہربانیاں کی ہیں۔ اور جس طرح جوشؔ صاحب کو خوش کرنے کے لئے ہندوستانی حکومت نے کئی مشہور ہندو شاعروں مثلاً جوشؔ ملسیانی۔ تلوک چند محرومؔ۔ فراقؔ گورکھپوری۔ منورؔ لکھنوی اور منشی گوپی ناتھ امنؔ وغیرہ کو نظر انداز کئے رکھا ہے اُسے مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ جوشؔ صاحب نہ صرف احسان فراموش ہیں بلکہ اپنے تھوڑے سے فائیدے کے لئے بھارت کو چھوڑ کر پاکستان میں جا بسنے کی وجہ سے مُلکی غدّار بھی ہیں۔ اور میرے دِل میں ایک احسان فراموش اور غدّار شخص کے لئے رتّی بھر بھی عزّت نہیں۔ چاہے وہ کتنا ہی لائق فائق کیوں نہ ہو۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ سردار صاحب اور بھڑک اٹھے اور اُن کا پارہ ایک سو دس ڈگری تک چڑھ گیا۔ نہایت غُصّے کی حالت میں بولے۔ "معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں جو گروپ جوشؔ صاحب کا مخالف ہے آپ بھی اُسی کے ممبر ہیں۔" مَیں نے نرمی سے کہا کہ میرا دہلی یا لکھنؤ کے کسی گروپ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مَیں اپنے آپ کو کوئی بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ پاکستان جانے سے پیشتر جوشؔ صاحب کی شاعری کا مَیں بھی بہت مدّاح تھا۔ اور میرے دِل میں اُن کے لئے کافی احترام تھا۔ لیکن مَیں ایمانداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ جوشؔ صاحب نے پاکستان جا کر ہمارے دیش کے کاز (CAUSE) سے غدّاری کی ہے اس لئے اب مجھے اُن کے نام سے نفرت ہے۔ باتوں باتوں میں بات بڑھتی جا رہی تھی سردار صاحب چاہتے تھے۔ کہ جوشؔ ملیح آبادی کے متعلق مَیں بھی اپنے نظریے میں تبدیلی کر لوں۔ لیکن میرے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے مَیں وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اگلے دِن دہرہ دون پہنچا تو میرے ذہن میں سردار صاحب کی باتیں گونج رہی تھیں۔ کئی دِنوں تک مَیں سردار صاحب کی باتوں پر

غور کرتا رہا۔ اور آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ سردار دیوان سنگھ صاحب چونکہ جوش صاحب کے گہرے دوست ہیں۔ اسلئے یہ اُس کی غداری پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لیکن میرے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ چاہے سردار صاحب مجھ سے کتنے ہی ناراض ہو جائیں۔ چند دنوں کے بعد میں نے ایک نظم کہی جس کا عنوان تھا۔ "کیا جانیں" اُس نظم کے دو شعر میں نے جوش ملیح آبادی کو تصوّر میں رکھتے ہوئے کہے۔ جو حسب ذیل ہیں ؎

اپنی ہی خوشی اور اپنا سُکھ ہے پیشِ نظر جن کے ہر دم
وہ مہر و وفا کو کیا سمجھیں۔ وہ رسمِ محبّت کیا جانیں
جو ترکِ وطن پر آمادہ ہو جائیں فقط زر کی خاطر
وہ قوم کی اُلفت کیا سمجھیں۔ وہ مُلک کی عظمت کیا جانیں

نوٹ :۔ یہ نظم میں نے اپنے اخبار " دیش سیوک " میں شائع کی اور بعد ازاں اپنے مجموعہ کلام " شرارے " کے صفحہ نمبر ۱۳۴ پر بھی چھاپی ہے۔

(پنڈت خوشدل)

مَیں نے جب سردار دیوان سنگھ مفتوں کی تصنیف شُدہ کتاب "ناقابلِ فراموش" میں جوش ملیح آبادی کے متعلق سردار صاحب کے ارشادات پڑھے تو حیران رہ گیا۔ انہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۵۴۱ پر لکھا ہے۔

"میرا یہ یقین ہے کہ اگر شاعرِ انقلاب جوش بھی اپنے شراب کے اندازہ اور پینے کے وقت کے پابند نہ ہوتے تو آج ہندوستان و پاکستان اُردو زبان کے اس مُلہم سے بھی محروم ہو گیا ہوتا۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ حضرت جوش صاحب جب شراب پیتے ہیں۔ تو اپنے سامنے گھڑی رکھ لیتے ہیں تاکہ وقت کے پابند رہیں اور زیادہ نہ پئیں۔"

اُسی کتاب کے صفحہ نمبر ۶۰۹ پر جوش صاحب کے متعلق مزید چھپا ہے۔

دوسرے شعراء تو رات کو ضرورت سے زیادہ شراب پیتے ہیں پینے کے بعد قے کرتے ہیں

اور صبح درد سر کے ساتھ دس۔ بارہ بجے تک کروٹیں لیا کرتے ہیں مگر جوش صاحب نے اپنے اندازہ سے زیادہ کبھی شراب نہیں پی۔"

مَیں سردار صاحب سے اس معاملے میں متفق نہیں ہوں۔ مَیں نے جوش صاحب کو دو مرتبہ شرابی حالت میں دیکھا ہے اور دونوں مرتبہ وہ نشے میں دُھت تھے۔ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ڈی۔ اے وی کالج دہرہ دُون کے ہال میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں جوش ملیح آبادی عرش ملسیانی۔ مخمور دھلوی۔ ساغر نظامی۔ روش صدیقی۔ مجاز لکھنوی۔ بسمل شاہجہانپوری روشن دہلوی۔ ساحر ہوشیارپوری اور گلزار زتشی شامل ہوئے۔

مقامی شاعروں میں مندرجہ ذیل شعراء نے اپنا اپنا کلام پڑھا تھا۔ مفتوں شکوہ آبادی۔ سفیر صاحب۔ پنڈت خوشدل۔ رونق صاحب اور تبسم صاحب۔

اُس مشاعرے کی صدارت میرے دوست سید مجتبیٰ حسین کوثر گورنمنٹ پلیڈر نے کی تھی۔ منتظمانِ مشاعرہ اور مشاعرے میں شریک ہونیوالے سب شعراء اس امر کے گواہ ہیں کہ اُس رات جوش ملیح آبادی اس قدر شراب پیئے ہوئے تھے کہ کوشش کرنیکے باوجود وہ ایک رُباعی تک نہ پڑھ سکے۔ آخر گلزار زتشی دہلوی نے جوش صاحب کی چند رُباعیاں پڑھکر سُنائیں۔ یہی حال مجاز لکھنوی کا تھا۔ وہ اسٹیج پر چڑھتے ہی گر گئے اور بڑی مشکل سے اپنی غزل کے دو چار اشعار سُنا سکے۔ مسوری کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے بعد جب جوش ملیح آبادی کاپنے ایک اور ساتھی شاعر کے ساتھ اُس وقت کے کمانڈنٹ انڈین ملٹری اکیڈمی جنرل حبیب اللہ کے بنگلے پر ٹھہرے اور آدھی رات کو شراب کے نشے میں بدمست ہوکر جو خرمستیاں اُنہوں نے کیں اور جس طرح جنرل صاحب نے دونوں شاعروں کو فوراً اپنا بنگلہ خالی کرنے کے لئے کہا اور راتوں رات ایک موٹر یا ٹیکسی کے ذریعہ جوش صاحب اور ان کا ساتھی دہلی روانہ ہوئے۔ اُس واقعہ کو جاننے والے اشخاص کس طرح سردار دیوان سنگھ کی اس بات کو تسلیم کرلیں گے کہ جوش ملیح آبادی گھڑی سامنے رکھ کر شراب پیتے ہیں۔

اور اُنہوں نے اپنے اندازے سے زیادہ کبھی شراب نہیں پی۔

جوش صاحب کے متعلق اس غلط بیانی کے علاوہ ایک دیگر واقعہ نے بھی میرے دل میں سردار دیوان سنگھ کی عزت کم کردی۔

دہلی ہائیکورٹ کے جسٹس مسٹر فالشلا نے جب میرے خلاف دی گئی درخواست خارج کردی تو اُسی شام کو مَیں جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" سے ملنے اُن کے دفتر میں پہنچا۔ خوشتر صاحب سے میرے دوستانہ تعلقات کئی سالوں سے ہیں اور جب بھی مَیں دہلی جاتا ہوں تو ضرور ان سے مل کر آتا ہوں۔ وہ بھی جب کبھی ڈیرہ دون آتے ہیں مجھے ملنے کے لئے دفتر "دیش سیوک" میں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ اُن دنوں سردار دیوان سنگھ اور خوشتر صاحب میں سخت دُشمنی تھی۔ لیکن مَیں دونوں حضرات سے برابر ملتا رہتا تھا۔ چنانچہ دہلی میں اکثر مَیں سردار دیوان سنگھ کے ہاں ٹھہرنے کے باوجود خوشتر صاحب سے ملے بغیر ڈیرہ دون واپس نہ آتا تھا۔ اُس شام کو جب خوشتر صاحب کو مَیں نے بتایا کہ ہائی کورٹ میں میرے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے دی گئی درخواست خارج ہو گئی ہے تو انہوں نے اس خوشی میں ایک مختصر سی دعوت کا انتظام کیا۔ دعوت کے آخر میں جب مَیں اور خوشتر دونوں بیٹھے تو مَیں نے اُنھیں رائے دی کہ وہ سردار دیوان سنگھ سے صُلح کرلیں۔ وہ بولے۔ "مَیں تیار ہوں"۔ مَیں نے کہا۔ "چونکہ اس جھگڑے کے سلسلے میں پہل آپ نے کی تھی۔ اور سردار دیوان سنگھ کے خلاف ایک آرٹیکل اپنے ماہنامہ "بیسویں صدی" میں چھاپا تھا اس لئے آپکو ان سے معافی مانگنی چاہیئے۔" خوشتر صاحب بولے "جیسے آپ کہیں۔ مَیں ویسے کرنے کے لئے تیار ہوں"۔ مَیں نے کہا کہ کل صبح ناشتے پر مَیں سردار صاحب سے اس سلسلے میں بات چیت کروں گا۔ پھر آپکو فون کروں گا۔ آپ فوراً دفتر ریاست میں پہنچ جائیں اور آتے ہی سردار صاحب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیں وہ رضامند ہو گئے۔ اور کچھ دیر گپ شپ لڑانے کے بعد مَیں سردار صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔

صبح ناشتے پر مَیں نے سردار صاحب سے بات چلائی۔ اور اُن سے کہا کہ تھوڑی دیر میں خوشتر صاحب یہاں آئیں گے اور آپ سے معافی مانگینگے۔ آپ اُن کو اپنا عزیز جان کر معاف کر دینا تاکہ اس دُشمنی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ سردار صاحب ایکدم سنجیدہ ہو کر بولے۔ پنڈت جی آپ میری فطرت سے واقف نہیں ہیں۔ مَیں نے اپنے دُشمن کو کبھی معاف نہیں کیا ہے۔ مَیں نے زمی سے انھیں سمجھایا۔ کہ کسی شخص کو معاف کر دینے سے جو دِلی سکون ملتا ہے وہ انتقام لینے سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیوں خوامخواہ کا بوجھ اپنے دماغ پر رکھا جائے۔ جب وہ غلطی تسلیم کر کے آپ سے معافی مانگنے کے لئے آ رہے ہیں تو آپ بھی یہ جھگڑا ختم کر دیں۔ میری بات سُن کر سردار صاحب کچھ گرم ہو کر بولے "پنڈت جی۔ آپ فوراً اُس کو فون کر دو کہ وہ یہاں نہ آئے"۔ مَیں نے سنجیدہ ہو کر اور اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ مَیں تو اُن کو فون کر رہا ہوں۔ کہ وہ فوراً یہاں پہنچ جائیں کیونکہ رات کو مَیں اُن سے وعدہ کر آیا تھا اور وہ میرے فون کے منتظر ہوں گے۔

اس پر سردار صاحب گرج کر بولے "دیکھیے پنڈت جی۔ اگر خوشتر یہاں آیا تو مَیں اُسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ مَیں ہرگز ہرگز اس سے صُلح نہیں کرنا چاہتا اور اس معاملے میں اگر آپنے زیادہ زور دیا تو مَیں آپ کے ساتھ بھی اپنے تعلقات ختم کر لوں گا"۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ میرا خیال تھا کہ سردار دیوان سنگھ میری اس مخلصانہ کوشش کی قدر کرے گا۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ شخص (سردار دیوان سنگھ) اس قدر کینہ پرور ہے، اس لئے مَیں نے فون اُٹھایا اور خوشتر صاحب سے کہدیا کہ وہ دفتر "ریاست" میں نہ آئیں۔ سردار صاحب کی اس ہٹ دھرمی اور ضدی طبیعت کے باعث میرے دِل میں ان کی عزت کچھ اور بھی کم ہو گئی۔ اسکے باوجود مَیں نے اُن سے قطع تعلق نہ کیا اور جب بھی دہلی جاتا تو اُن سے ضرور ملتا۔

جون ۱۹۵۹ء میں اپنے ایک کام سے جب مَیں دہلی گیا تو اپنے ایک اور دوست کے ہاں ٹھہرا۔ واپس آنے سے پیشتر جب مَیں سردار دیوان سنگھ سے ملنے گیا تو اُنہوں نے بتایا کہ اُن کا ارادہ اس سال کے آخر میں "ریاست" اخبار بند کر کے کانگڑہ چلے جانے کا ہے اور وہ اپنی باقی ماندہ زندگی

وہیں گزار دیں گے میں نے تجویز پیش کی کہ وہ کانگڑہ کی بجائے راجپور میں اپنی رہائش رکھیں
سردار صاحب نے کہا کہ وہ راجپور کی بستی کو دیکھنے کے بعد ہی اس تجویز پر غور کر سکیں گے میں نے
اُنھیں دہرہ دُون آنے کی دعوت دی تا کہ اُنھیں راجپور کی بستی دکھا سکوں۔ چند دنوں کے
بعد سردار صاحب دہرہ دون آئے اور میں اُنھیں راجپور لے گیا۔ یہ جگہ اُن کو بہت پسند آگئی اور
اُنہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ میں نے اُن کے لئے ایک کاٹیج کا بندوبست کر دیا۔

میں اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے سردار دیوان سنگھ کو راجپور میں مستقل رہائش
رکھنے کا مشورہ دیکر سخت غلطی کی۔ کیونکہ اُن کے یہاں آنے سے پیشتر تو میرے دل میں جو احترام اُن کے
لئے تھا۔ اُس میں تھوڑی کمی آئی تھی۔ لیکن یہاں آنے کے بعد جب مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا
موقع ملا۔ تو مجھے اُن سے بول چال بھی بند کر دینی پڑی۔ میری رائے میں سردار دیوان سنگھ
میں دو خامیاں ایسی ہیں کہ جن کے سامنے اُن کی تمام خوبیاں ماند پڑ جاتی ہیں اور جن کے باعث
کوئی خوددار شخص اُن سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہ کرے گا۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ سردار صاحب
ہر معاملے میں اپنی رائے ہی کو درست سمجھتے ہیں اور اپنے نظریہ کو فوقیت دیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ
اختلاف رائے کو نہ صرف برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ بلکہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والے شخص کا مذاق
اُڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسری اور سب سے بڑی خامی اُن میں یہ ہے کہ یہ کانوں کے بہت کچے ہیں۔
کسی شخص سے اُن کے تعلقات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں لیکن اگر کوئی شرارتی شخص اُن کے اور
اُس دوست یا واقف کار کے درمیان پھوٹ ڈلوانا چاہے تو وہ آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب
ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اُن کو یہ کہہ دیا جائے کہ آپ کا فلاں دوست یا واقف کار فلاں جگہ پر آپ کی بُرائی
کر رہا تھا تو یہ فوراً آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اپنے دوست یا واقف کار کے خلاف نازیبا ریمارکس کسنے
لگتے ہیں۔ سردار صاحب یہ سوچنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کرتے کہ جو شخص اُنھیں ایسی باتیں کہہ رہا ہے
وہ کس قماش کا انسان ہے اور نہ یہ اُس شرارتی شخص کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتے
ہیں۔ اُن کی اس کمزوری نے اُن کے کئی گہرے واقف کاروں اور ہمدردوں کو اُن سے دُور کر دیا ہے

خود میرے ساتھ بھی سردار صاحب نے یہی سلوک کیا۔ ایک بار تو اپنے سگے بھتیجے امرناتھ کھنہ کی غلط بیانیوں کو صحیح سمجھ کر آپنے میرے خلاف بے بنیاد الزامات لگانے شروع کر دیئے۔ یہ کھنہ (امرناتھ کھنہ) چھبیس ۲۶ سالوں کے بعد مجھے دہرہ دون آکر ملا تھا اور میرے پاس قریباً آٹھ ماہ تک رہا تھا۔ پیشی سے دہرہ دون آیا تھا۔ اور راستے میں دہلی بالکل نہ رکا۔ اور نہ سردار دیوان سنگھ اپنے چچا سے ملا۔ مَیں نے دونوں (چچا۔ بھتیجے) کا ملاپ یہاں کروایا۔ اور اُسے اپنے چچا یعنی سردار دیوان سنگھ کے ساتھ راجپور میں رہنے پر زور دیا۔ وہ مان گیا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اُن دونوں میں اَن بن ہوگئی۔ اور وہ سردار صاحب کو کافی مالی نقصان پہنچا کر دہلی چلا گیا اور پھر یہاں واپس نہ آیا۔ اُس شخص یعنی امرناتھ کھنہ کے متعلق حالات کسی وقت پھر تحریر کروں گا۔ میرے خلاف جو غلط اور بے بنیاد باتیں امرناتھ کھنہ نے اپنی مطلب براری کے لئے سردار دیوان سنگھ سے کہیں اُن کی تصدیق کئے بغیر سردار صاحب نے مجھ پر جھوٹے الزامات لگانے شروع کر دیئے اور مَیں نے اُن کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب کھنہ یہاں سے بھاگ گیا۔ اور سردار صاحب کو پتہ چل گیا کہ وہ جھوٹا تھا تو مَیں نے پھر اُن کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔

دوسری بار ایک اور شرارتی شخص اور میرے ایک سابقہ ملازم درشی پرکاش فلک منظفرنگری) نے میرے خلاف اُن کے کان جا کر بھرے۔ اور یہ میرے دشمن بن بیٹھے۔ ان کا فرض تھا کہ یہ فلک منظفرنگری کی کہی ہوئی باتوں کا مجھ سے ذکر کرتے۔ لیکن ایسا کرنے کی بجائے یہ میرے مخالفوں کے پاس جا پہونچے اور مجھے بدنام کرنے اور نقصان پہنچانے کے منصوبے باندھنے لگے۔ یہ فلک منظفرنگری دہرہ دون میں سب سے پہلے میرے پاس آکر رہا اور ایک سال کے قریب میرے اخبار "دلیش سیوک" میں کام کرتا رہا اور یہیں سے بطور فلک منظفرنگری مشہور ہوا۔ اچھا شاعر ہونیکے باوجود یہ اچھا انسان نہیں۔ اوّل درجہ کا خودغرض۔ غیر ذمہ دار اور شرارتی شخص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دلیش سیوک" کی ملازمت چھوڑنے کے بعد نہ تو یہ دفتر "فرنٹیر میل" میں جم سکا اور نہ ہی ہسٹر کلکے اخبار "دون درپن" میں۔ آخر کار دہرہ دون سے دہلی چلا گیا وہاں بھی جب اُسے کسی اخبار میں ملازمت نہ ملی تو یہ پنجاب چلا گیا اور آجکل لدھیانہ

کے ایک اخبار میں ملازم ہیں۔ اس احسان فراموش اور شرارتی شخص نے میرے عزیز دوست شری یگیہ ولکبیہ دتہ آف فریڈم میل سے بھی جاکر کہا تھا کہ پنڈت جی آپ کے خلاف ایک آرٹیکل ڈیشن سیوک میں شائع کر رہے ہیں۔ دتہ تو اسی شام میرے پاس پہنچ گئے۔ اور انہوں نے فلک کی کہی ہوئی بات بتلاتے ہوئے پوچھا کہ ان کے خلاف کون سا آرٹیکل لکھا جا رہا ہے۔ میں نے جب ان کو وہ آرٹیکل دکھایا تو انہوں نے فلک مظفر نگری کی شان میں جو ریمارکس کسے انہیں میں یہاں لکھنا نہیں چاہتا۔ جب فلک نے دیکھا کہ اس کا یہ تیر خالی گیا ہے تو وہ چند دنوں کے بعد سردار دیوان سنگھ کے پاس راجپور جا پہنچا۔ اور ان سے کہا کہ پنڈت خوشدل ڈیشن سیوک کے اگلے پرچے میں ان کے خلاف ایک آرٹیکل شائع کر رہے ہیں۔ سردار صاحب بھی اگر بردبار اور سمجھدار ہوتے تو دتہ صاحب کی طرح وہ بھی مجھ سے مل کر اس سلسلے میں اپنی تسلی کر لیتے۔ اور اس طرح فلک کی شرارت بے نقاب ہو جاتی۔ لیکن یہ تو اپنی عادت سے مجبور تھے۔ اس لئے انہوں نے رشی پرکاش فلک کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ اور میرے خلاف پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا۔ نیز میرے مخالفوں سے مل کر مجھے نقصان پہنچانے اور بدنام کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ میرے دل پر سردار صاحب کی ان حرکتوں کا برا اثر پڑا۔ اور میں نے ان کے ہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا۔

اگرچہ سردار دیوان سنگھ کے بارے میں مجھے یہ سو فیصدی یقین ہو چکا ہے کہ "نام بڑے لیکن درشن چھوٹے" کا قول ان پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے کیونکہ انہوں نے میرے خلاف سنی سنائی باتوں کی بنا پر غلط الزامات لگائے۔ نیز جب ان کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ میرے خلاف ان کے کان بھرنے والے اشخاص (رام ناتھ کھنہ ان کا بھتیجہ۔ اور رشی پرکاش فلک) اول درجہ کے جھوٹے غیر ذمہ دار اور شرارتی ٹائپ کے انسان تھے پھر بھی سردار صاحب نے اپنی زیادتیوں اور غلط بیانیوں کے لئے اظہار افسوس کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے باوجود ان کے بڑھاپے کے پیش نظر اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ان کو راجپور میں رہنے کا مشورہ دینے والا میں ہی تھا۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں ان کی کچھ خدمت کر سکوں۔ مجھے ان کی موجودہ حالت پر بہت ترس آتا ہے اور میں بھگوان سے

یہ پرارتھنا کرتا رہتا ہوں کہ وہ اُن کو نیک عقل بخشے۔ اور اُن کے دِل سے دُشمنی اور کدورت کے خیالات نکال دے۔ میری خواہش ہے کہ سردار دیوان سنگھ مفتون اپنی ہٹ دھرمی کو ترک کر کے اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کو کھُلے دِل سے تسلیم کر لیا کریں۔ تاکہ اس بُڑھاپے میں یہ اپنے ہمدرد لوگوں کی صحبت سے محروم نہ رہیں۔ اور اپنی آخری زندگی سکون و خوشی کے ساتھ گذار سکیں۔

ہو نہیں سکتا

یہ مت سمجھو بُرا انسان اچھا ہو نہیں سکتا
اِرادہ جب بشر کر لے تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
جو اپنے دِل پہ قابو رکھ نہیں سکتا کسی صورت
خدا کی ذات پر اُس کا بھروسا ہو نہیں سکتا
زباں کچھ اور کہتی ہے۔ عمل کچھ اور کہتا ہے
خدا کے نیک بندوں سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
بجا کہنا کسی کا ہے کہ حرکت ہی میں برکت ہے
جو قطرہ جم کے رہ جائے وہ دریا ہو نہیں سکتا
جو عالی ظرف ہیں کرتے ہیں خدمت بے غرض سب کی
مگر کم ظرف سے ایسا ارادہ ہو نہیں سکتا
وہ کوئی اور ہوں گے بیچ دیں جو دین و ایماں کو
مگر خوش دل سے تو ایماں کا سودا ہو نہیں سکتا

شری مہابیر تیاگی

دہرہ دون آنے سے پیشتر ہی میں شری مہاویر تیاگی کا نام سُن چکا تھا لیکن اُن سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہاں آکر میں نے اپنا اخبار "دیش سیوک" جاری کیا تو اُس کے چند مہینوں کے بعد تیاگی جی سے ملنے کا موقع ملا۔ پہلی ملاقات میں میرے دل پر اُن کی باتوں کا بہت اچھا اثر پڑا۔ اور میں روز بروز اُن کے قریب ہوتا گیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جب میں نے "دیش سیوک" کا "سیوا نمبر" نکالا تو تیاگی جی سے میں نے درخواست کی کہ وہ "دیش سیوک" کے متعلق اپنی رائے تحریر کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے دہلی سے ایک خط مجھے بھیجا جو انگریزی میں تھا۔ اس خط کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

میرے پیارے پنڈت خوشدل جی۔

بحیثیت ایک کامیاب اخبار نویس آپ نے جو ترقی کی ہے اُس کے لئے میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

آپ کا اخبار "دیش سیوک" نہایت سُرعت سے پبلک میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ مقامی اخبارات جو روزمرّہ کی خبریں اور دیگر مسائل اپنے ناظرین کے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ جنتا کو تعلیم دینے کے حقیقی ذریعہ ہیں اور مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ آپ کے لیڈنگ آرٹیکلز اور تبصرے نہ صرف کانگریس کے اصولوں سے موافقت رکھتے ہیں بلکہ نہایت قابلِ قدر۔

موثر۔ اور دلیرانہ ہوتے ہیں۔

میں آپ کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔

آپ کا:- مہاویر تیاگی

نوٹ:- یہ ترجمہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کے پرچے یعنی "سیوا نمبر" میں چھپ چکا ہے۔

چند ملاقاتوں کے بعد میرا یہ خیال بن گیا کہ شری مہاویر تیاگی اول درجہ کے دیش بھگت قول کے پابند۔ اور غریبوں کے سچے ہمدرد ہیں۔ لیکن افسوس جوں جوں میں اُن کے قریب ہوتا گیا۔ توں توں میرے پہلے خیال میں تبدیلی ہوتی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ میں نے اُن سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔

دوسرے عام چناؤ سے کچھ عرصہ پیشتر دہرہ دون کے ایک سوشل ورکر نے اپنے گھر مجھے اور تیاگی جی کو چائے پر بلایا۔ اور ہماری بول چال پھر شروع ہو گئی۔ لیکن اس عرصہ میں تیاگی جی کے متعلق میرے خیالات میں بہت تبدیلی آچکی تھی۔ اسلئے ہمارے تعلقات میں پہلے جیسی بے تکلفی پیدا نہ ہوئی۔ اور جب کبھی سال یا چھ مہینے کے بعد کسی پبلک جلسہ میں تیاگی جی سے ملاقات ہو جاتی۔ تو وہ رام سلام اور ایک دوسرے کا حال چال دریافت کرنے تک ہی محدود رہتی۔

۱۹۵۹ء کے ماہ مئی کے پہلے ہفتے میں مجھے ٹائیفائیڈ بخار ہوا جس کے باعث مجھے کئی دنوں تک چارپائی پر لیٹا رہنا پڑا۔ ۱۸ مئی ۱۹۵۹ء کی رات کو قریباً گیارہ بجے شری مہاویر تیاگی اور دہرہ دون سے اُس وقت کے ایم۔ ایل۔ اے۔ شری پی۔ بی۔ شرن میرے مکان پر تشریف لائے تیاگی جی کے ہاتھ میں "دیش سیوک" کا تازہ پرچہ تھا۔ آتے ہی بولے۔ "بھئی خوشتر ل۔ ویسے تو تمہاری ہر نظم قابلِ تعریف ہوتی ہے لیکن اس بار تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ آج ہی مجھے تمہارے اخبار کا پرچہ ملا ہے اور میں نے سرورق پر جب تمہارے اشعار پڑھے تو پھڑک اُٹھا۔ سوچا تمہیں ان شعروں کی داد ضرور دینی چاہیئے۔ شرن صاحب کو ساتھ لیکر تمہارا مکان تلاش کرتے رہے

اور کافی دوڑ دھوپ کے بعد تمہارے اس مکان کا پتہ لگا۔" تو اب کیا حکم ہے ؟" مَیں نے پوچھا
تیاگی جی بولے ۔ بس آدھ گھنٹہ بیٹھ کر تم سے تمہارا کلام سنیں گے اور اس کی داد دیں گے۔

اگرچہ بیماری اور کمزوری کے باعث مَیں اُس وقت کچھ سُنانے کے مُوڈ میں نہیں تھا تاہم گھر میں آئے ہوئے ان دونوں سجنوں کو مَیں نے اپنی کئی نظمیں سُنائیں جن کی دِل کھول کر دونوں نے داد دی ۔ بارہ بجے رات کے قریب دونوں نیتا میرے مکان سے گئے ۔ اگلے دِن مَیں جب دس بجے کے قریب ڈاکخانہ سے اپنی ڈاک لینے جارہا تھا تو گھوسی گلی کے سرے پر واقع ایک پان اور چائے کی دوکان (جس میں ہر روز مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈرز اور ورکرز رات کو آکر بیٹھتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کرتے رہتے ہیں) کے قریب ایک شخص نے بتایا کہ گذشتہ رات کو ۱۲ بجے شری نہاویر تیاگی یہاں آئے تھے ۔ اور میرے اشعار پڑھ کر یہاں بیٹھے لوگوں کو سُناتے رہے اور میری شاعری کی بہت تعریف کرتے رہے ۔ اُسی دِن بعد دوپہر جب مَیں ایک کام کے باعث کچہری پہنچا تو شری جتیندر ناتھ ایڈووکیٹ ایڈیٹر " وین گارڈ " کے بستہ پر چند وکلا صاحبان بیٹھے تھے جنھوں نے مجھے بتایا کہ ایک گھنٹہ پہلے شری نہاویر تیاگی یہاں آئے تھے اور بار روم میں (BAR ROOM) میں موجود وکلا صاحبان کو میرا کلام پڑھ کر سُناتے رہے اور میری شاعری کی تعریف کرنے کے بعد اُنہوں نے حاضرین کو بتایا کہ وہ گذشتہ رات میرے مکان پر میری شاعری کی داد دینے بھی گئے تھے۔

مجھے یہ سُنکر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ۔ حیرت اس لئے کہ کیوں تیاگی جی نے ان دنوں میری شاعری کی تعریف کرنی شروع کر دی ہے ۔ اور آدھی رات کے وقت میرے مکان پر آنے کی کیوں زحمت اُٹھائی ۔ اور خوشی اس لئے کہ مَیں نے تیاگی جی کے خلاف اپنے اخبار میں کافی کچھ لکھا لیکن اسکے باوجود ان کے دِل میں میری اور میری شاعری کی کچھ عزت ہے ۔ یکا یک ایک وکیل نے پوچھا ۔ پنڈت جی ۔ ویسے تو ہر شخص اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے لیکن شاعر تو اپنے کلام کی تعریف سُن کر پھولا نہیں سماتا ۔ دہرہ دون کی سیاست میں اول مقام تو شری نہاویر تیاگی کو حاصل ہے اور دوسرا شری بی ۔ بی ۔ شرن کو ۔ یہ دونوں لیڈر جب رات کو آپ کے مکان پر کلام کی داد دینے گئے تو آپ کو

یقیناً بہت خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔ "بالکل نہیں" میرا جواب تھا۔

سوال کرنے والے وکیل صاحب کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

بولے۔ "آخر کیوں؟"

میں نے کہا۔ کاش کوئی مسلمان داد دینے آیا ہوتا۔ شری سوہن لال ایڈوکیٹ بول اٹھے۔ پنڈت جی۔ ہم آپ کی اس بات کا مطلب نہیں سمجھے؟۔

میں نے کہا۔ آپ سمجھ بھی نہیں سکتے جب تک اسے میں خود نہ سمجھاؤں۔ یہ کوئی قانونی نقطہ تو ہے نہیں جو آپ خود ہی سمجھ جائیں گے۔ میرے اس جواب کا پس منظر جب تک آپ مجھ سے سمجھ نہ لیں۔ آپ اس کی صداقت اور گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اچھا تو بتائیے۔

شری جتیندر ناتھ نے بے صبری سے کہا۔

"تو سنیئے" میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی شخص نے بتایا تھا کہ جوش ملیح آبادی (جو پاکستان جا چکے ہیں) ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کے لئے بمبئی پہنچے۔ تو وہاں کے ایک تاجر کو اُن کی دو غزلیں بہت پسند آئیں۔ چنانچہ مشاعرے کے خاتمے کے بعد وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ جوش صاحب سے ملا اور جاتے ہی بولا۔ "حضرت مجھے آپ کی غزلیں بہت پسند آئی ہیں اور میں اُن کی داد دینے کے لئے اس وقت حاضر ہوا ہوں۔

جوش صاحب بولے آپ کی عنایت ہے اور ذرّہ نوازی ہے جو آپ کو میرا کلام پسند آیا۔ وہ تاجر بولا۔ حضرت کوئی بنیا یا براہمن آپکے کلام کی داد دینے نہیں آیا میں سخن فہم اور اچھے شاعروں کا قدردان ہوں اور پکا مسلمان ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اُس تاجر نے چند ہزار روپے جوش صاحب کے آگے رکھدیئے۔ بتایا جاتا ہے کہ جوش صاحب نے وہ روپیہ لینے سے بہتیرا انکار کیا لیکن وہ تاجر بضد رہا اور آخر کار وہ روپیہ جوش صاحب کو بطور داد دیکر ہی گیا۔ یہ قصہ سُنانے کے بعد میں نے اپنے وکیل مہربانوں سے کہا کہ اگر یہ دونوں لیڈر صاحبان بھی اسی وقت میری بیماری کے موقع پر میری کچھ مدد کرتے تو اُن سے داد پانے کی مجھے کچھ خوشی

بھی ہوتی۔ یہ اگر میرے لیے کچھ پھل ہی لے آتے تو بھی مَیں یہ سمجھتا کہ ان کے دِل میں عملی مدد کا کچھ جذبہ تو ہے۔ مگر یہ تو بالکل خالی ہاتھ آئے۔ اور میری بیماری اور کمزوری کے باوجود ایک گھنٹہ تک میری نظمیں سُنتے رہے اور واہ واہ کے نعرے بُلند کرتے رہے۔ بتائیے ایسی داد سے مجھے کیا خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے میرے مہربان وکلا صاحبان نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا۔ اور مَیں کچہری کا کام ختم کرنے کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا۔

چند دنوں تک میرے دماغ پر نیتا جی کا میرے گھر پر آدھی رات کو آنا اور میرے کلام کی داد دینا بُری طرح چھایا رہا۔ آخر مَیں نے اپنے اُس وقت کے خیالات کو ایک نظم کی صورت میں ڈھالا۔ اور ۱۶ جون ۱۹۵۹ء کے اخبار "دیش سیوک" میں وہ نظم شائع کر دی۔ وہ نظم حسب ذیل تھی۔

داد ۔ یا ۔ بے داد

ایک شاعر جو ہے بیماری و غربت کا شکار — دامنِ اُمید جس کا ہو چکا ہے تار تار
خونِ دل سے جو لکھا کرتا ہے اپنی داستاں — راستبازی کی جھلک ہے جس کے شعروں سے عیاں
صاف کہنے اور لکھنے سے جو گھبراتا نہیں — اپنی خستہ حالی پر جو اشک برساتا نہیں
ایک شب جب سو رہا تھا وہ ادیبِ نیم جاں — نیند میں بھولا ہوا تھا زندگی کی تلخیاں
اک صفِ اوّل کا نیتا اُس کے گھر پر آ گیا — اور بولا کس غضب کا شعر تم نے لکھ دیا
جس کے ہر اک لفظ سے رنگِ حقیقت ہے عیاں — ہے تمہارا قابلِ تعریف اندازِ بیاں
اس کو پڑھتے ہی میرا دِل ہو گیا ہے بے قرار — داد دینے کے لئے اس شعر کی بے اختیار

اب اِسی باعث سے آیا ہوں کہ تم کو داد دوں
اتنے اچھے شعر کہنے پر مبارک باد دوں

سُن کے نیتا جی کی باتیں خوش تو شاعر ہو گیا — اور فرمائش پہ اُن کی کچھ کلام اپنا پڑھا
لیکن اُس کے دل کی کیفیت کو کیا جانے کوئی — کاش اُس کے جوہروں کی قدر پہچانے کوئی

ایک مُدت سے ہے جو نا قدر دانی کا شکار — سختیاں دُنیا کی جو سہتا رہا ہے بے شمار
زندگی جس کے لئے ہے اک عذابِ مستقل — چاٹتا ہے فاقہ مستی میں جو اپنی خاکِ دل
صرف ہمدردی بھلا کیا کام اُسکے آئے گی — داد سے کیا بھوک اُس کے پیٹ کی مٹ جائیگی
جلد تر اب دردِ دل اُس کا مٹانا چاہیئے — پنجۂ افلاس سے اُس کو چھُڑانا چاہیئے
داد دیتے ہو اگر تو کچھ کرو امداد بھی — تاکہ کچھ تو چین پائے یہ دلِ ناشاد بھی

ورنہ شاعر کے لئے یہ داد بھی بے داد ہے
مرثیئے کے رنگ میں خوشدل مُبارک باد ہے

ایک اور واقعہ جس نے میرے دل پر یہ نقش کر دیا کہ نام بڑے لیکن درشن چھوٹے کے مصداق یہ حضرت (شری مہاویر تیاگی سابق منسٹر مرکزی سرکار) بھی صرف گفتار کے غازی ہیں۔ کردار کے نہیں۔ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

جنوری ۱۹۶۲ء کے آغاز میں ایک دن میں شری بی بی شرن کی کوٹھی پر گیا تو تیاگی جی کو وہاں بیٹھے ہوئے پایا۔ شرن صاحب اُس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن دِنوں میری طبیعت بہت خراب چل رہی تھی۔ اور میں بہت کمزور دکھائی دیتا تھا۔ تیاگی جی نے میری حالت پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "خوشدل۔ تمہاری صحت بہت گرتی جا رہی ہے اسے سنبھالنے کے لئے تمہیں پورا ایک مہینہ آرام کرنا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "پچھلے پندرہ سالوں میں پورا ایک ہفتہ تو مجھے آرام کرنے کا موقع ملا نہیں۔ ایک ماہ کے لئے کام کیسے چھوڑ سکتا ہوں"۔ تیاگی جی سنجیدہ ہو کر بولے۔ "زیادہ کام کرنے کی وجہ سے ہی تمہاری صحت خراب ہوئی ہے اسلئے میرا کہا مانو۔ ایک ماہ کے لئے دہرہ دون سے کہیں باہر چلے جاؤ اور مکمل آرام کرو۔" میں ہنسا۔ اور بولا۔ تیاگی جی۔ یہ ناممکن ہے میرے مالی حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں پانچ دنوں کے لئے یہاں سے کہیں باہر جا کر نہیں رہ سکتا۔ اب تیاگی جی بڑے ہمدردانہ لہجے میں

میں بولے۔ "میں تمہاری حالت جانتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ اگر تم ایک ماہ کے لئے کہیں باہر جاکر رہنے کا پروگرام بنالو تو اُس کے لئے تمہیں کتنے روپے کی ضرورت ہے؟"

Rs 500/-

"پانچ سو روپے" میں نے فوراً کہہ دیا۔

وہ کیسے؟

Rs 250/- Rs 250/-

دیکھئے ڈھائی صد روپے کا تو میں گھر میں راشن ڈال دوں گا۔ اور اڑھائی صد روپیہ لیکر میں کسی دوسری جگہ جاؤں گا۔ وہاں باقاعدہ دوا کے ساتھ غذا بھی کھاؤں گا اُسی وقت طبیعت کچھ درست ہوگی۔ تیاگی جی بولے۔ "تم فوراً باہر جانے کی تیاری کرو۔ میں ایک ہفتہ کے اندر تمہیں پانچسو روپیہ دے دوں گا۔

میں گھر آیا۔ اور اپنی بیوی سے تیاگی جی کی اس "مدد" کا ذکر کیا۔ اگلے دن اپنے دوست دتہ جی کو بھی میں نے یہ بات بتادی۔ اور میں دہرہ دون سے باہر جانے کا پروگرام بنانے لگا۔ کافی سوچ وچار کے بعد میں نے یہ طے کیا کہ میں رشی کیش سے دو اڑھائی میل دور "سورگ آشرم" میں جاکر ایک ماہ تک رہوں۔ ایک تو وہ جگہ بہت ایکانت اور سکون بخش ہے دوسرے وہاں بہت سے لوگ میرے اچھے واقف کار تھے۔ اور سابق مہنت سوامی سُندر پرکاش تو میرے خاص مہربان تھے اور اُن دِنوں زندہ تھے۔

ایک ہفتہ کے بعد میں تیاگی جی سے ملا۔ لیکن اُنہوں نے اس سلسلہ میں کوئی بات ہی نہ کی۔ مجھے اُن کی اس بے رُخی پر مایوسی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ لیکن میں نے بھی اُن سے روپیہ کی بابت کچھ نہ کہا اس کے چند دنوں کے بعد تیاگی جی راہ چلتے ملے۔ تو میں نے کہا۔ میں نے ایک ماہ کے لئے سورگ آشرم میں جانے کا پروگرام بنا لیا ہے اب صرف آپکے وعدے کے وفا ہونے کا انتظار ہے۔ تیاگی جی بولے۔ "میں آج رات کو دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں سے ایک ہفتہ کے بعد واپس آؤں گا۔ پھر آپکے لئے ضرور روپے کا بندوبست کردوں گا۔ میں تیاگی جی کا یہ جواب سُنکر حیرت میں ڈوب گیا۔

تیاگی جی دہرہ دون واپس پہنچے تو اپنے چناؤ کے کام میں مصروف ہوگئے۔ ایک آدھ بار جب

اُن سے مُلاقات ہوئی۔ تو اُنہوں نے اپنے وعدے کے متعلق کچھ نہ کہا۔ مَیں نے بھی دوبارہ اُن کو اس سلسلہ میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اب چونکہ الیکشن کا پراپاگینڈہ زور شور سے شروع ہو چکا تھا اس لئے مَیں نے اپنا پروگرام باہر جانے کا ملتوی کر دیا۔ اور یہ طے کر لیا کہ چناؤ کے بعد "سورگ آشرم" میں آرام کرنے کی غرض جاؤں گا۔

الکشن ختم ہو گئے۔ لیکن تیاگی جی نے پھر بھی اپنا وعدہ وفا نہ کیا۔ اس لئے میرے دِل میں تیاگی جی کی عزت پہلے سے بھی کم ہو گئی۔ کیونکہ اُنہوں نے خود بخود میری صحت کو درست کرنے کی تجویز میرے سامنے رکھی۔ اور اس کے لئے مالی مدد دینے کی پیشکش کی۔ لیکن افسوس عملی طور پر کچھ نہ کیا اور خوامخواہ مجھے بھروسے میں رکھا۔ اسکے بعد تیاگی جی سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا لیکن میرے دِل میں اُن کی وعدہ خلافی کے باعث جو یہ خیال منضبط ہو چکا تھا کہ یہ بھی "نام بڑے لیکن درشن چھوٹے" کی زندہ مثال ہیں ابھی تک نہیں بدلا۔

بدلتے دیکھے

جن سے ملنا تھا زمانے کو بنا درسِ عمل
وہ بیانات و پیامات بدلتے دیکھے
جن کو ہم ستیہ و اہنسا کے پجاری سمجھے
اُن کے بھی قول و مقالات بدلتے دیکھے
جن کی نس نس میں بھرے ہوئے تھے قومی جذبے
کرسی ملتے ہی وہ جذبات بدلتے دیکھے
دیش سیوا کو جو کہتے تھے عبادت رب کی
اُن کے بھی آج خیالات بدلتے دیکھے

مہاراجہ پروین چندر بھنج دیو

۲۵ر فروری ۱۹۶۱ء کی صبح کو میں اپنے اخبار "دیش سیوک" کے دفتر میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ اورینٹل ہوٹل کے مالک کا ایک نوکر میرے پاس آیا اور اُس نے کہا "سردار جی (مالک ہوٹل) نے آپ کو ابھی بلایا ہے"۔ چنانچہ جب میں وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ آج صبح ایک مہاراجہ صاحب وہاں آئے ہیں اور انہیں کے کہنے پر مالک ہوٹل نے مجھے بلوا بھیجا ہے۔

میں حیران تھا کہ کسی مہاراجہ کو مجھ سے کیا کام پڑ سکتا ہے اور دہرہ دون میں یہ کس غرض سے آئے ہیں۔ مالک ہوٹل نے مجھے بتایا کہ مہاراجہ صاحب نے آتے ہی دہرہ دون کے کسی جرنلسٹ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں چونکہ آپ کو نہایت ایماندار اور فرض شناس اخبار نویس سمجھتا ہوں۔ اس لیے میں نے آپ کو بلانے کے لیے اپنے نوکر کو بھیج دیا۔ میں جب ہوٹل کے مالک سردار جنگ سنگھ کے ساتھ مہاراجہ صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک سادھو (جس نے اپنا نام سوامی پورنانند بتایا) سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ وہ مہاراجہ کا بستر کا راج گرو ہے۔ اور مہاراجہ صاحب اخبار میں اپنا ایک بیان چھپوانا چاہتے ہیں۔ راج گرو نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہتے کہتے ہوئے مزید کہا کہ مہاراجہ صاحب ابھی پوجا میں ہیں اور پانچ دس منٹوں میں آجائیں گے۔ چنانچہ مالک ہوٹل تو کمرے سے باہر چلا گیا اور میں وہاں مہاراجہ کا انتظار کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹوں کے بعد مہاراجہ صاحب تشریف لائے۔ گورا رنگ نورانی چہرہ۔ سر پر لمبے لمبے بال۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ گلے میں بڑھیا سلک کی قمیض اور سرخ رنگ کی ریشمی دھوتی پہنے نیز ایک بہت بڑھیا شال اوڑھے ہوئے تھے۔ آتے ہی بولے۔ "پنڈت جی۔ میں یہاں ایک پریس کانفرنس کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے آپکو کشٹ دیا ہے۔ آپ یہاں کے اخباری نمائندوں کو مجھ سے ملانے کا پربندھ کر دیں۔"

چند منٹوں کی گفتگو کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ مہاراجہ دقیانوسی خیالات کا مالک ہے جو پرانی رجواڑہ شاہی کو پھر سے زندہ کرنے کے خواب لے رہا ہے۔ جب مہاراجہ بستر نے مجھے بتایا کہ ان کا مقصد "نریندر منڈل" (انگریزی حکومت میں مہاراجوں اور نوابوں کی ایک جماعت اس نام سے تھی) کو دوبارہ قائم کرنا ہے۔ تو میں نے از راہ مذاق کہا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام راجاؤں۔ مہاراجاؤں اور نوابوں کو پھر ایک مرکز پر اکٹھا کریں۔ تو راجہ مہندر پرتاپ سے ملئے۔ وہ نہ صرف پارلیمنٹ کے ممبر ہیں بلکہ انٹرنیشنل شہرت کے مالک ہیں اور وہ بھی آپ کی طرح ہی سوچتے ہیں اور پرانی رجواڑہ شاہی کو بحال کرنے کے حق میں ہیں۔"

مہاراجہ بستر میرے اس مشورہ پر بہت خوش ہوئے اور بولے۔ "ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن وہ ملیں گے کہاں؟" میں نے عرض کیا کہ "وہ راجپور میں رہتے ہیں اُن کی کوٹھی "پرتاپ کوٹھی" کے نام سے مشہور ہے اور راجپور کے بس اڈے سے بہت نزدیک ہے"۔ اتنا سُننا تھا کہ مہاراجہ بستر نے اس سادھو کو (جو اپنے آپ کو راج گورو کہتا تھا) سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ فوراً ٹیکسی لے کر راجپور جائیں اور راجہ مہندر پرتاپ سے مل کر میری ملاقات کا وقت مقرر کر آئیں"۔

میں قریباً ایک گھنٹہ تک مہاراجہ بستر کی دلچسپ لیکن بے معنی باتیں اور

اسکیمیں سُنتا رہا۔ ہوٹل کے مالک سردار صاحب بھی دوبارہ تشریف لے آئے
تھے اور مہاراجہ صاحب کی بے وقوفی سے بھری ہوئی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے
تھے۔ اور گاہے بگاہے میری طرف دیکھ کر مسکرا اُٹھتے تھے۔ مثلاً ایک موقعہ
پر مہاراجہ نے جلال میں آکر بلند آواز سے کہا: "خوشدل جی۔ میں بھارت میں
کو ہلاہل مچا دوں گا اور تمام مہاراجاؤں کو ان کی ریاستیں واپس دلا دوں گا۔"
یہ سُن کر میں بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

میں نے پوری سنجیدگی سے مہاراجہ بستر کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس
پروگرام کو ترک کر دیں اور کانگریسی حکومت کو دھمکیاں دینے کی بجائے اس سے
تعاون کریں۔ اور اپنے علاقہ کے غریب لوگوں کی ٹھوس خدمات کرنے کا کوئی موثر
پروگرام بنائیں۔ مہاراجہ نے میرا مشورہ سُن کر کہا: "میں ایک سناتن سنگھ بنا
رہا ہوں۔ جس کے ذریعہ تمام بھارت واسیوں کی سیوا کر دوں گا۔ میں تو ایک دھارمک
آدمی ہوں بھارت سرکار نے خوانخواہ مجھے سیاست میں گھسیٹ لیا ہے۔ میں یہاں
راجہ مہندر پرتاپ سے ملنے اور یہاں کے اخبار نویسوں کو اپنا بیان دینے کے بعد
رکھی کیش جاؤں گا اور وہاں کے چند مشہور سادھوؤں سے ملوں گا۔"

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد مہاراجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا آپ سوامی شوانند کو جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح" میں نے جواب دیا۔

"کیسے ہیں وہ"... اُن کا دوسرا سوال تھا۔

میں نے جب سوامی شوانند کے متعلق ان کو اپنی رائے بتائی۔ تو وہ حیرت
سے میری طرف دیکھنے لگے

مہاراجہ بستر کے زیادہ اصرار پر میں نے اگلے دن کی شام کو چار بجے پریس

کانفرنس کا وقت مقرر کر دیا۔ اور چلا آیا۔ رات کو مجھے جو دو تین اخبار نویس مل سکے اُن سے میں نے مہاراجہ لبسنٹر کی پریس کانفرنس کا ذکر کر دیا۔ دوسرے دن مجھے پتہ چل گیا کہ دو تین مقامی جرنلسٹس مہاراجہ صاحب کو رات کو ہی ہوٹل میں مل لئے تھے۔ اور مہاراجہ اورینٹل ہوٹل کو چھوڑ کر وائٹ ہاؤس ہوٹل میں چلے گئے ہیں۔

چنانچہ میں دوپہر کو اپنے دوست شری وائی۔ ڈبلیو۔ ویتھ آف "فرنٹیر میل" اور شری کشوری لال آنند ایڈیٹر "دیوار" (جو اس وقت نگر کانگریس کمیٹی کے سکرٹری تھے) کے ساتھ مہاراجہ لبسنٹر سے وائٹ ہاؤس میں ملا اور انہیں مشورہ دیا کہ پریس کانفرنس سے ان کا کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ اسی ارادہ کو ترک کر دیں۔ مہاراجہ نے میرا مشورہ مان لیا اور ہم تینوں مہاراجہ صاحب کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے وائٹ ہاؤس سے چلے آئے۔

یہ دقیانوسی خیالات کا مالک مہاراجہ "نام بڑے لیکن درشن چھوٹے" کی سو فیصدی درست مثال تھا۔ اسی لئے اس کا ذکر میں نے اس باب میں کرنا مناسب سمجھا ہے۔

قطعہ

غلط جذبات کے دھاروں میں تو میں بہہ نہیں سکتا
حقیقت کو بیاں کرنے سے ہرگز رہ نہیں سکتا
میں اپنے دل کی حالت کو اچھی کس طرح کہہ دوں
اندھیری رات کو میں صبح روشن کہہ نہیں سکتا

غائبانہ امداد

مجھے یہ نیصدی یقین ہو چکا ہے کہ جو شخص نیکی ایمانداری اور سچائی کے راستوں پر چلتا ہے اس کی مشکل وقت میں قدرت اس طرح مدد کرتی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے قدرت کا آپ کوئی نام رکھ لیں بھگوان۔ خدا۔ واہگرو یا گوڈ (GOD) لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قدرت کے کاموں میں نہ تو کوئی دخل دے سکتا ہے اور نہ کوئی شخص اس کے رازوں کو سمجھ سکتا ہے۔

"راضی برضا" یعنی بھگوان کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی بات تو ہر شخص کرتا ہے لیکن اس اصول پر عمل کرنا کس قدر مشکل اور پریشان کن ہے اس کا اندازہ وہی اشخاص لگا سکتے ہیں کہ جنہوں نے اپنی ڈور بھگوان کے ہاتھوں میں سونپ رکھی ہے اور ہر حال میں مطمئن اور خوش رہتے ہیں۔

میری اپنی زندگی میں درجنوں بار ایسا ہوا کہ میرے حالات سخت مخالف اور تکلیف دہ صورت اختیار کر گئے اور ان میں پھنس کر میں سخت پریشان ہو گیا ان حالات سے رہائی حاصل کرنے کی مجھے کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن ہر بار بھگوان نے میری اس طرح مدد کی کہ میں دنگ رہ گیا

اور مجھے ایسے اشخاص سے مدد مل گئی کہ جن سے مدد لینے کے متعلق میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

اس باب میں تین ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن کو پڑھکر یہ ثابت ہو جائے گا کہ بھگوان پر بھروسہ کرنے والا شخص اور حق و صداقت کا پرستار انسان انتہائی مشکلات میں پھنسکر بھی ذلیل و خوار نہیں ہوتا اور بھگوان اس کی اچھی شہرت کو بٹہ نہیں لگنے دیتے۔

پنڈت خوشدل

بڑی بات

جیتے جی جس کو کوئی بھی راحت نہ ہو
اور حاصل جسے مال و دولت نہ ہو
اُس بشر کا جسے رب سے قربت نہ ہو
حق کے نغمے سُنانا بڑی بات ہے

ہر بشر کی یہ خواہش ہے اونچا اُٹھے
اہل زر کی بدولت وہ آگے بڑھے
اس غرض کے زمانے میں نادار کے
بے غرض کام آنا بڑی بات ہے

ایٹمی دَور کے معجزے دیکھ کر
عقل حیرت کے چکر میں ہے سر بسر
جس خدا کو نہ دیکھیں گے ہم عمر بھر
اُس پر ایمان لانا بڑی بات ہے

پولیس کے چنگل سے رہائی

سنہ ۱۹۴۳ء میں جب میں رشی کیش میں رہتا تھا تو وہاں ایک سادھنی سے اور اس کے چیلے سے میرا جھگڑا ہو گیا انھوں نے مجھے پھنسانے کے لئے میرے خلاف چوری کا جھوٹا مقدمہ بنانا چاہا۔ ایک پولیس دیوان کو کافی روپے دیکر میرے خلاف تین چار برتنوں کی چوری کی رپورٹ درج کروا دی گئی۔ یہ برتن اس سادھنی سے میں نے مانگ کر گھر کے استعمال کے لئے کچھ عرصہ پہلے سے لے رکھے تھے، چنانچہ رپورٹ میں انہی برتنوں کو بھی فہرست میں شامل کر دیا گیا اور پولیس نے میرے گھر پر چھاپہ مارنے کا پروگرام بنایا۔ اس کی اسکیم یہ تھی کہ برتن میرے گھر سے برآمد ہوتے ہی مجھے حوالات میں بند کر دیا جائے۔ اور میرے خلاف چوری کا مقدمہ کھڑا کر دیا جائے۔

مجھے صبح ہی ایک شخص کے ذریعہ اس سادھنی نے ایک سندیسہ بھیجا کہ اگر بدنامی اور جیل سے بچنا چاہتے ہو تو رشی کیش چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ میں نے کہلا بھیجا کہ میں ہر صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس طرح کسی دباؤ کے تحت رشی کیش سے باہر نہ جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے دل کو آنے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار کر لیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ اس زیادتی اور زبردستی کا مردانہ وار مقابلہ کروں گا۔

اگرچہ یہ اطلاع مجھے پہنچ چکی تھی کہ میرے خلاف چوری کی رپورٹ تھانے میں دی جا چکی ہے اور پولیس میرے مکان پر تلاشی لینے کے لئے آئے گی۔ لیکن میں نے سادھنی سے مانگے ہوئے برتنوں کو کسی دیگر جگہ رکھنے کی بجائے گھر ہی میں

رہنے دیا۔ میری دھرم پتنی اس سلسلے میں میرے ساتھ کافی جھگڑا کر چکی تھی وہ چاہتی تھی کہ میں وہ برتن سوامی دیو انند منیجر ویدک آشرم رشی کیش کے پاس رکھ آؤں کیونکہ وہ تمام معاملے کی اصلیت سے واقف تھے اور میرے بہت مہربان اور ہمدرد تھے۔ مگر میں اپنی دھرم پتنی کی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ جب میں نے یہ برتن مانگ کر لئے ہیں تو ان کی چوری کا الزام کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میری بیوی میری ضد کے سامنے رو دھو کر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد رشی کیش کے آنریری مجسٹریٹ سوامی اچھے نند جی میرے مکان پر آئے وہ ہانپ رہے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بہت دُور سے بھاگ کر آئے ہیں آتے ہی بولے "مسٹر خوشدل۔ میں ایک کام سے دہرہ دون جا رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے جب پولیس تھانہ کی طرف سے گذرا تو وہاں داروغہ اور ایک دیوان معیت چار پولیس کانسٹبل وردی پہنے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے سلام کیا تو میں نے پوچھا آج صبح صبح کس کی شامت آگئی ہے جو آپ لوگ وردی کس کر تیار کھڑے ہیں داروغہ نے کہا۔ ایک سادھنی نے ایک پنجابی نوجوان کے خلاف چوری کی رپورٹ درج کروائی ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ چوری کا کچھ مال خوشدل کے گھر میں ہی ہم وہیں جا رہے ہیں۔

سوامی جی نے بتایا کہ داروغہ کی بات سُنکر انہوں نے حیرت سے کہا "کون وہ پنڈت خوشدل جو آریہ سماج کے پاس والے مکان میں رہتا ہے" داروغہ جی بولے ہاں ہاں وہی بد دماغ نوجوان جو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ تب سوامی جی نے کہا میں یہ بات نہیں مان سکتا کہ وہ چوری جیسا گھٹیا کام کر سکتا ہے ہاں اگر تم یہ کہتے ہو کہ اس کے گھر میں ناجائز اسلحہ یا باغیانہ

لڑ بیچر کی اطلاع ملی ہے تب تو میں مان بھی لیتا۔ لیکن میں کسی صورت سے نہیں مان سکتا کہ وہ چوری کر سکتا ہے داروغہ جی نے پوچھا۔ کیا آپ اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ سوامی جی نے جواب دیا ہاں میں بہت عرصے سے اُسے جانتا ہوں۔ تھانیدار صاحب جھینپ کر بولے۔ جناب ہم تو قانون کے بندے ہیں ہمارے پاس چوری کی رپورٹ درج ہے پھر ایک تحریری اطلاع بھی موجود ہے کہ چوری شدہ کچھ برتن خوشدل کے گھر میں پڑے ہیں اس لئے ہم تو اپنا فرض ادا کریں گے۔ اور اس کے گھر کی تلاشی لینے ضرور جائیں گے۔ سوامی جی نے بات کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے کہا —— ہاں بھئی تمہارا شکار جب سامنے ہو تو اُسے چھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے جائیے اپنا فرض پورا کیجئے۔ یہ کہہ کر سوامی جی ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ گئے لیکن آگے جا کر اپنا راستہ بدل کر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے میرے گھر پہنچ گئے اور مجھے یہ سب باتیں بتا دیں۔ سوامی جی نے کہا دیکھو وقت مت ضائع کرو۔ جو سامان اس سادھنی کا تمہارے پاس ہے اُسے کسی پڑوسی کے ہاں رکھ آؤ۔ میں نے جب ان کا کہا ماننے سے انکار کیا تو جناب کچھ گرم ہو کر انگریزی میں بولے۔

" MR. KHUSHDIL YOU DO NOT UNDERSTAND THE COMPLICATIONS OF LAW. IF ANYTHING IS FOUND IN YOUR HOUSE. WHICH. IS MENTIONED IN THE THEFT. REPORT, THEN YOU WILL BE IN HOT WATERS."

یعنی تم قانون کی پیچیدگیاں نہیں جانتے۔ اگر تمہارے گھر سے کوئی ایسی چیز ملتی ہے جو چوری کی رپورٹ میں درج ہے تو تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ میری دھرم پتنی جو میری ضد کے سامنے ہار مان کر خاموش بیٹھی تھی

سوامی جی کے آنے پر پھر بولنے لگی۔ اور اصرار کرنے لگی کہ میں سوامی جی کا کہا مان کر یہ برتن کہیں اور رکھ آؤں۔

آخر کار میں نے سوامی جی کا مشورہ مان کر وہ برتن سوامی دیوانند جی کے پاس بھجوا دیئے۔ اور سوامی اچھے آنند کا موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے پولیس کی آمد کا بیتابی سے انتظار کرنے لگا۔ سوامی اچھے نند جا چکے تھے۔ لیکن میں نے اُن کی آمد کو ایک غائبانہ مدد سمجھ کر من ہی من میں بھگوان کا بھی شکریہ ادا کیا۔

کچھ دیر بعد ایک پولیس کا دیوان آیا اور مجھے تھانہ میں لے گیا۔ وہاں داروغہ جی سے بات ہوئی۔ انھوں نے مجھے کافی ڈرایا دھمکایا۔ لیکن میں بالکل نہ گھبرایا بلکہ میں نے کہا کہ اگر مجھے بدنام کرنے کے لئے میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوایا گیا۔ تو میں گو سوامی گنیش دت کی معرفت شری پنا لال ممبر لیجسلیٹو کونسل یو پی گورنمنٹ کے نوٹس میں سارا معاملہ لے آؤں گا۔ دیوان صاحب نے پھر مجھے لالچ دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم رشی کیش چھوڑ کر ہردوار چلے جاؤ۔ تو میں اس سادھنی سے تمہیں چار پانچ سو روپے نقد بھی دلوا دوں گا لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا اور رشی کیش چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اور اس معاملے پر غور کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس کے بعد پولیس نہ تو میرے مکان پر تلاشی لینے آئی۔ اور نہ ہی میرے خلاف چوری کی رپورٹ کے بارے میں کچھ کارروائی کی۔ یہ سب کچھ سوامی اچھے نند کی مہربانی سے ہوا۔ بھگوان نے انھیں میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ اور اس طرح میں ایک ایسے جال میں پھنسنے سے بچ گیا۔ جس سے رہائی حاصل کرنا میرے لئے سخت مشکل کام ہوتا۔ ——— (پنڈت خوشدل)

سرکاری قرضے کی بیباقی

دہرہ دون میں آکر اخبار "دیش سیوک" جاری کرنے سے پہلے میری ملاقات جنرل موٹر ٹرانسپورٹ کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر شری جگدیش شرن گوئل سے ہوئی تھی ۔ یہ بہت رنگیلی طبیعت کے اور دلچسپ انسان ہیں۔ پُرانے ٹائپ کے رئیس ہیں اور ناٹک و ڈراموں کے شوقین ۔ انھوں نے ایک تھیٹریکل کمپنی بنائی تھی۔ جس میں پہلے پہل میں نے بھی کچھ تعاون دیا۔ لیکن بہت جلد میں نے اپنا دستِ تعاون کھینچ لیا۔ ہاں ان سے ملنے اور اپنا مشورہ دینے کے لئے کبھی کبھی ان کے دفتر میں ضرور چلا جاتا تھا۔ اُسی دفتر میں ایک سجن کام کرتے تھے جن کا نام تھا پنڈت جگدیشور ـــــ بہت سادہ اور ہمدرد طبیعت کے انسان تھے کٹر دھارمک خیالات رکھتے تھے۔ اور انڈا گوشت اور شراب وغیرہ سے کوسوں دور رہتے تھے میری ان سے چند ملاقاتوں میں گہری واقفیت ہو گئی اور یہ اکثر میرے ہاں آیا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد جنرل موٹر ٹرانسپورٹ کمپنی کا کام بند ہو گیا اور یہ بیکار ہو گئے چونکہ جتنی تنخواہ انہیں ملتی تھی اُس سے باپ اور بیٹے (ان کا ایک لڑکا بھی ان کے پاس رہتا تھا جو ڈی۔ اے۔ وی کالج میں پڑھتا تھا) کا گزارا ہی مشکل سے چلتا تھا اس لئے بچت کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ جب بیکاری کا سامنا کرنا پڑا تو یہ پنڈت جی بہت پریشان ہو گئے اور میری مدد کے طالب

ہوئے۔ میں نے ان کے لئے دو تین جگہوں پر کام تلاش کر دیا اور وقت ضرورت خود بھی تھوڑی سی مدد ان کی کر دیا کرتا۔

ایکدن میں سخت پریشانی کی حالت میں بیٹھا تھا کہ پنڈت جگدیشور جی آ گئے۔ پوچھنے لگے آج کیا بات ہے۔ خوشدل کے مکھ پر اداسی کی لکیریں دکھائی دے رہی ہیں۔ میں نے انہیں ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "کوئی خاص بات نہیں ویسے ہی کچھ طبیعت اداس ہے۔" وہ بولے میں پانچ چھ سالوں سے آپ کو جانتا ہوں اس لئے آپ کے اس جواب سے میری تسلی نہیں ہو سکتی۔ ضرور کوئی خاص ہی وجہ ہے اور وہ کارن آپ کو مجھے بتانا ہوگا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "پنڈت جی۔ آپ کا اندازہ درست ہے بیشک آج مجھے بہت پریشانی ہے لیکن اس پریشانی کا حل چونکہ آپ کے پاس نہیں اس لئے آپکو بتانا نہیں چاہتا۔" وہ گرم ہو کر کہنے لگے۔ اگر میں آپ کی مصیبت کو دور نہیں کر سکتا تو کوئی اپائے تو بتا سکوں گا...... آپ صاف صاف کہیں۔ کہ کیا مصیبت آن پڑی ہے — میں نے اپنا گلا صاف کیا اور کہا تو سنئے۔ کئی سال پیشتر میں نے سرکار سے دو ہزار روپے قرض لئے تھے وہ روپیہ ابھی تک ادا نہیں کر سکا۔ گذشتہ ڈیڑھ دو سالوں سے اس قرضے کی جلد ادائیگی کرنے کے لئے رفیوجی دفتر سے کئی خطوط آئے لیکن میں رفیوجی افسر سے ملکر مہلت لیتا رہا۔ اب دہرہ دون میں سرکار کی طرف سے دیئے گئے قرضہ جات ادا نہ کرنے والوں کے خلاف وارنٹ قرقی جاری کئے جا رہے ہیں اور ان کا مال و اسباب قرق کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ رفیوجی افسر مجھ پر بہت مہربان ہے اور میرا بہت لحاظ کرتا ہے لیکن کل دہلی سے کسٹوڈین جنرل...... یہاں کے دفتر کا کام چیک کرنے کے لئے آ رہا ہے چنانچہ مجھے رفیوجی افسر نے کہا تھا کہ میں آج شام سے پہلے اپنا قرضہ

ضرور بے باق کر دوں ۔ ورنہ وہ میرے بھی قرقی وارنٹ نکالنے پر مجبور ہو جائیگا کیونکہ اُن کی ملازمت کا سوال ہے اس لئے اگر آج شام تک سرکاری خزانے میں روپیہ داخل نہ کر سکا یا کسی دیگر شخص کے کلیم سے اپنے قرضے کی رقم وضع نہ کروا سکا تو کل سارا مال و اسباب قرق ہو جائے گا۔

" مجھے اپنے سامان کا کوئی غم نہیں۔ غم تو یہ ہے کہ ایمانداری کے اور سچائی کے راستوں پر چلنے کے باوجود دُنیا میں ذلالت کا مُنہ دیکھنا پڑے گا۔" میرے غم کی یہ کہانی سُن کر پنڈت جگدیشور بولے۔" پنڈت جی آپ جیسے سچے آدمی کو دُنیا میں کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ بھگوان نے آج تک آپکی آڑے وقتوں میں امداد کی ہے آج بھی بھگوان کی کرپا سے آپ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینگے اور شام تک قرضے کی بے باقی ہو جائے گی۔

میں نے دھیمی آواز سے کہا۔" لیکن اس کی کوئی صورت تو مجھے دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی سمجھ میں آتی ہے۔

اب پنڈت جگدیشور نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

" دیوتا جی ــ یہ خدمت بھگوان نے میرے ذمہ لگائی ہے اس لئے یہ سیوا میں کروں گا۔ میرے پاس میرے مکان کا ایک کلیم ہے اُس کلیم میں سے آپ کے قرضے کی رقم جمع کروا دوں گا۔"

میں نے اپنی آواز میں مضبوطی پیدا کرتے ہوئے کہا۔" ایسا میں ہرگز نہ کروں گا آپ کی مالی حالت مجھ سے بھی بدتر ہے کوئی امیر واقف کار اگر یہ پیش کش مجھے کرتا تو میں منظور بھی کر لیتا۔ لیکن آپ جیسے غریب آدمی سے اتنی بڑی رقم یعنی دو ہزار روپے لینا کسی صورت میں بھی ٹھیک نہیں۔

پنڈت جگدیشور بھی اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔" دیکھیے

پنڈت جی۔ قدرت نے مجھے آپکی سیوا کرنے کا پہلا موقع دیا ہے آپ نے آج تک میرے لئے بہت کچھ کیا ہے میں آپکی نیکیوں کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ بھگوان نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں آپکی اس مصیبت کو دور کر سکوں تو کیوں پیچھے ہٹوں۔ جس مکان کا یہ کلیم ہے وہ میں نے اپنی کمائی سے بنایا تھا میری عورت کا دیہانت کافی عرصہ سے ہو چکا ہے میرے دو لڑکے ہیں دونوں ہی میرے فرمانبردار ہیں۔ وہ میرے کسی کام پر اعتراض نہیں کرتے اور نہ ہی کلیم میں سے آپ کا قرضہ چکانے پر کوئی اعتراض کریں گے۔ اس لئے میں نے اپنے دل میں پکا نشچہ کر لیا ہے کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ اور اس سلسلے میں آپ کی کوئی دلیل نہ سنوں گا۔

کافی دیر تک میں پنڈت جگدیشور کو ایسا کرنے سے روکتا رہا لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ اپنے ارادے پر اٹل ہیں اور سچے دل سے میری امداد کرنا چاہتے ہیں تو میں بھی رضا مند ہو گیا چنانچہ میں نے اُن سے کہا کہ وہ اپنا کلیم لے آئیں اور میرے ساتھ رفیوجی دفتر چلیں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر پنڈت جی اپنے کلیم کے کاغذات لے آئے اور ہم دونوں رفیوجی دفتر میں پہنچ گئے۔ میں نے رفیوجی افسر سے سارا حال کہہ دیا۔ انھوں نے کلیم کے کاغذات دیکھے اور اُس کے بعد پنڈت جگدیشور سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھئے آپکو اس کلیم کے مواقق ڈھائی ہزار یا پونے تین ہزار روپے سرکار سے ملیں گے۔ جو روپے آپ پنڈت خوشدل کے قرضے کے کٹوا دیں گے وہ روپے اسی کلیم کی رقم سے کٹ جائیں گے اور آپ کو فقط چند سو روپے ہی ملیں گے۔ پنڈت جگدیشور فوراً بولے "سرکار آپ میرے کلیم کے سارے روپے کاٹ لیجئے اور مجھے ایک پائی تک نہ دیں لیکن میرے مترپنڈت جی کی تو خلاصی کر دیں۔ ان کا حساب تو صاف ہو جائیگا"

رفیوجی افسر نے بہتیرا پنڈت جگدیشور کو سمجھایا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں لیکن اُن کا ایک ہی جواب تھا کہ میں آج تک پنڈت خوشدل سے سیوا لیتا رہا ہوں آج اُن کی سیوا کرنے کا موقع ملا ہے تو اب نہیں چُوک سکتا۔ روپے پیسے کا کیا ہے بھگوان نے دینا ہے تو اور کسی طرح دیدے گا۔

آخرکار رفیوجی افسر نے اکاؤنٹنٹ کو بلایا اور اُسے حکم دیا کہ اُس کلیم سے میرے قرضے کی رقم کاٹ کر میرا حساب صاف کر دیا جائے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ میں نے سرکاری قرضے کی بے باقی کے لئے دو تین ایسے گہرے واقف کاروں سے گذارش کی تھی کہ جن کے پاس لاکھوں روپے کے کلیم تھے اور جو میرے ساتھ بہت ہمدردی جتایا کرتے تھے لیکن اُنہوں نے کسی نہ کسی بہانے سے مجھے ٹال دیا اور عملی طور پر میری کوئی مدد نہ کی۔ بھگوان کی قدرت دیکھو کہ جس شخص سے میں پانچ روپے کی مدد کی بھی توقع نہ کر سکتا تھا اُس نے مجھے سرکاری قرضے سے نجات دلائی اور خود نہایت غریب ہوتے ہوئے بھی دو ہزار روپے اپنے کلیم سے کٹوا دیئے اور مجھے ذہنی پریشانی اور دُنیاوی ذلت سے بچا لیا۔ پنڈت جگدیشور کا تو میں تا زندگی احسان مند رہوں گا لیکن میں اسے بھگوان کی طرف سے غائبانہ امداد سمجھتا ہوں اور ہمیشہ یہی سمجھوں گا۔

حقیقت

خزاں کے خوف کو یکسر مٹا کر
مرے دل کی کلی اب کھل رہی ہے
غریبی اور مجبوری کے صدقے
حقیقت کی حقیقت مل رہی ہے

ہتکِ عزّت کا مقدمہ

ویسے تو میرے خلاف ایک درجن کے قریب ہتک عزت کے مقدمات دائر کئے گئے لیکن ان میں سے دو تین ہی اہم اور قابلِ ذکر ہیں یہاں میں ایک ایسے مقدمے کا حال درج کر رہا ہوں جو بہت اہم اور پریشان کُن تھا یہ مقدمہ راجپور میں رہنے والی دو انگریز عورتوں (مسز ای۔ایچ ونیز پال (MRS. E-H. VANSPALL اور مس۔ایم۔فرنچ & MISS M. FRENCH) نے مجھ پر دائر کیا تھا۔

میں نے ۲۱ اپریل ۱۹۵۶ء کے "دیش سیوک" میں ایک آرٹیکل لکھا تھا جس کا عنوان تھا ان بدزبان اور منہ پھٹ عورتوں کے منہ میں لگام دی جائے اس آرٹیکل میں میں نے دونوں انگریز عورتوں کے خلاف شدید نوعیت کے الزامات لگائے تھے۔ مثلاً (۱) وہ ہندوستانیوں کو کالا لوگ کہہ کر پکارتی ہیں (۲) اکثر اوقات اپنی گفتگو میں ڈیم انڈیا اور ڈیم نہرو گورنمنٹ (DAMN INDIA & DAMN NEHRU GOVERNMENT) کے کلمات ..... استعمال کرتی ہیں (۳) اپنے آپ کو انگریز نسل سے تعلق رکھنے کے زعم میں ہندوستانیوں سے سپیریر (SUPERIOR) سمجھتی ہیں۔(۴) مقامی حکام اور اپنے پڑوسیوں کے خلاف جھوٹی اور من گھڑت شکایات کرتی رہتی ہیں (۵) ہندوستانی حکومت کے خلاف غیر مناسب اور نازیبا پروپیگنڈہ کرتی رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میرے اس آرٹیکل سے ایک سال پہلے مقامی پولیس نے ان دونوں انگریز عورتوں کی جھوٹی رپورٹوں کی بنا پر ایک معزز ہندو خاتون شریمتی .... دھرم پتنی ڈاکٹر ہری کرشن سود ساکن ۱۹۷ راجپور روڈ دہرہ دون کے خلاف ایک مقدمہ زیر دفعہ ۱۰۷ تعزیرات ہند چلایا تھا لیکن اُس مقدمے میں مسز سود بری کر دی گئیں۔ چونکہ پولیس اور مقامی حکام گوری چمڑی والی ان انگریز عورتوں کی بے جا ناز برداری کرتے تھے اس لئے میں نے اس آرٹیکل کے ذریعہ ہوم منسٹر اُتر پردیش سرکار سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان انگریز عورتوں کے گذشتہ اور موجودہ رویہ کی تحقیقات سی۔ آئی۔ ڈی کے کسی اعلیٰ افسر سے کرائیں اور اگر میرے لگائے الزامات صحیح ثابت ہو جائیں تو ان کے منہ میں یا تو لگام دی جائے یا اُنھیں اپنے ملک کو واپس جانے پر مجبور کر دیا جائے۔

اس مقدمے میں میرا ایک اہم گواہ تھا۔ شری سردار ی لال سہگل ریٹائرڈ جیلر۔ یہی شخص میرے پاس ڈاکٹر ہری کرشن کو لائے تھے اور انہوں نے ہی مجھے ان انگریز عورتوں کے متعلق ضروری اطلاعات بہم پہنچائی تھیں۔ اگرچہ سہگل صاحب نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے مقدمے میں گواہی دیں گے لیکن عین موقع پر اُنھوں نے انکار کر دیا۔ یہ صورتِ حالات بہت پریشان کن تھی۔ اگرچہ راجپور کانگریس کمیٹی کے پردھان بھائی جوگا رام اور سپرنٹنڈنٹ سٹی بورڈ برانچ راجپور اور دیگر گواہان کے ذریعہ میں نے اپنے آرٹیکل میں ان انگریز عورتوں کے خلاف لگائے الزامات کے ثبوت مہیا کر دیئے تھے لیکن سرداری لال سہگل کی گواہی بھی بہت ضروری تھی میں نے سہگل صاحب کو اس وعدہ خلافی کے لئے سخت سُست بھی کہا لیکن نہ جانے اُن کے دل میں ان انگریز

عورتوں کا کیا ڈر بیٹھ چکا تھا کہ وہ عدالت میں آکر گواہی دینے پر رضامند نہ ہوتے۔

میرا وکیل سوہن لال ایڈووکیٹ زور دے رہا تھا کہ سہگل صاحب کی جگہ ایک اور گواہ پیش کرنا ضروری ہے لیکن میں کس کو گواہی کے لئے کہوں۔ کسی مقدمے میں نہ تو میں نے کبھی جھوٹا بیان دیا تھا اور نہ کبھی کوئی جھوٹا گواہ پیش کیا تھا۔ دماغ پر دو تین دن تک یہ بوجھ رہا لیکن اس کا کوئی حل نہ سوجھا آخر ایک شام کو بھگوان نے غائبانہ مدد بھیجدی۔ میں گھنٹہ گھر سے راجپور روڈ کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے ملٹری کے ایک ریٹائر صوبیدار میجر گنپتی داس بالی ملے۔ یہ میرے اخبار کے گراہک تھے اور بہت با اصول اور ہمدرد انسان۔ مقدمے کا ذکر چلا تو بولے۔ "پنڈت جی۔ میرے دل میں آپ کے لئے بہت احترام ہے اس لئے اس مقدمے میں اگر میری گواہی کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کا مکان تو اولڈ ڈالمن والا میں ہے اور مجھے گواہ چاہیئے راجپور میں رہنے والا شخص۔ وہ بولے۔" آپ کو شائد اس بات کا پتہ نہیں۔ کہ میں پہلے راجپور ہی میں رہا کرتا تھا اور میری کوٹھی مسز ویز بال کے قریب ہی ہے اب اس کوٹھی میں میرا ایک لڑکا رہتا ہے جو ملٹری میں میجر ہے اور آج کل آسام میں ہے۔ میں ان کے اس انکشاف سے بہت خوش ہوگیا۔ تب تو آپ ان دونوں انگریز عورتوں کے متعلق بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ میجر بالی کہنے لگے" جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس سے بھی زیادہ۔" میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا۔" کیا آپ کے سامنے ان عورتوں نے کسی ہندوستانی کو" کالا آدمی" کہہ کر پکارا ہے بالی صاحب نے جواب دیا" ایک بار نہیں کئی بار۔ یہ تو تمام سبزی فروشوں، دھوبیوں۔ مالیوں اور بھنگیوں وغیرہ کو کالا۔ لوگ

کہتی ہیں میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا ہے۔

میں نے خوش ہو کر کہا تب تو آپ کی گواہی میرے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے اور سہگل صاحب کی گواہی سے بھی زیادہ مؤثر آپ کی شہادت ہوگی۔ وہ بولے "آپ عدالت سے میرے نام سمن بھجوا دیں۔ میں تاریخ مقررہ پر ضرور کچہری پہنچ جاؤں گا۔ بالی صاحب نے جو کہا اُسے پورا کر دیا یعنی عدالت میں میری طرف سے گواہی دی۔ جس کا عدالت پر بہت اچھا اثر پڑا۔ یہ بھگوان کی طرف سے میری غائبانہ امداد تھی کیونکہ میں اس امر سے بالکل ناواقف تھا کہ بالی صاحب کی ایک کوٹھی ان انگریز عورتوں کے قریب ہی ہے اور نہ ہی میرے بالی صاحب سے ایسے گہرے تعلقات تھے کہ میں ان کو اپنے مقدمے میں گواہی دینے کی گذارش کرتا

اس مقدمے کا فیصلہ مقامی اخبارات کے علاوہ ہندوستان کے قریبًا تمام ہندی۔ انگریزی اور اُردو کے مشہور اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ کیونکہ اس مقدمے کے فیصلے میں نہ صرف عدالت نے مجھے باعزت بری کر دیا تھا بلکہ مجھے اس آرٹیکل کی اشاعت پر مبارکباد بھی دی تھی۔ عدالت نے فیصلہ میں لکھا تھا کہ میرے آرٹیکل کا ایک ایک لفظ سچا اور مکمل طور پر صحیح تھا اور پبلک مفاد میں تھا۔ عدالت کا فیصلہ انگریزی میں تھا اور فل سکیپ سائز کے آٹھ صفحا پر مشتمل تھا اُس فیصلے کا صرف ایک ہی پیرا یہاں درج کیا جاتا ہے۔

IT WAS IN THE PUBLIC GOOD AND EVERY PATRIOT OF THE COUNTRY IS SUPPOSED TO DO SO AND STOP SUCH NUISANCE AS EARLY AS POSSIBLE. PANDIT KHUSHDIL—

SHOULD BE CONGRATULATED FOR HAVING BROUGHT SUCH INFORMATION TO THE NOTICE OF THE PUBLIC & THE GOVERNMENT.

یعنی وہ آرٹیکل پبلک مفاد میں تھا اور ہر دیش بھگت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایسی شرارت کو جتنی جلدی ہو سکے ختم کرائے۔

پنڈت خوشدل کو مبارکباد دی جانی چاہیئے کہ وہ ایسی اطلاع پبلک اور سرکار کے نوٹس میں لائے۔

میری دولت

دنیا میں مجھے ملتی ہے جتنی بھی سعادت
اور زیادہ
آتی ہے مجھے یادِ خدا اور فقط قوم کی خدمت
خوشدل کی تو دولت ہے
بھگوان یہ دولت ہو عطا اور زیادہ

عزم!

کشتی کو غرق کر سکے طوفاں کی کیا مجال
لیکن یہ شرط ہے کہ خدا پاسباں رہے
نقشہ بدل ہی ڈالیں گے بھارت کا ایک دن
کیا کام غم کا اس جگہ خوشدل جہاں رہے

سچّی باتیں

حق و نیکی کی جانب جو لشکر جایا نہیں کرتے
سکونِ دل تو وہ جیتے جی کبھی پایا نہیں کرتے

سمجھ لیتے ہیں جو اِک بار اِس دنیا کی اصلیت
وہ مال و زر کی گھاتوں میں کبھی آیا نہیں کرتے

وُہ انساں ہی نہیں انسانیت کو جو کرے رسوا
کہ بوئے بد چمن میں پھول پھیلایا نہیں کرتے

وہی ہیں مردِ کامل جن کا زندہ نام رہتا ہے
جہاں کی مشکلیں خاطر میں جو لایا نہیں کرتے

خدا کی رحمتیں اُن کے لئے مخصوص ہوتی ہیں
غریبوں بے کسوں پر جو ستم ڈھایا نہیں کرتے

یقیناً کاٹ دینا چاہیئے ایسے درختوں کو
تھکے ماندے مسافر پر بھی جو سایا نہیں کرتے

نہیں ممکن خوشی کا کر سکیں احساس وہ خوشدل
جو ہنس ہنس کر غم و رنج و الم کھایا نہیں کرتے

بُری عادتیں

بری عادتیں

ہم جس فعل کو بار بار کرتے ہیں وہ ہماری عادت بن جاتا ہے نیک اور بد عادات اسی طرح بنتی ہیں مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ایک ساتھی کے کہنے پر میں نے شوقیہ سگرٹ پینی شروع کی تھی۔ پہلے پہل تو والدین اور دیگر رشتہ داروں سے چھپ چھپ کر سگرٹ یا بیڑی کے کش لگاتا لیکن جوں جوں بڑا ہوتا گیا۔ سب کے سامنے سگریٹ پینے لگا عالم جوانی ہی میں اس بری عادت کا میں بری طرح غلام بن گیا اور روزانہ پچاس۔ ساٹھ سگریٹ پینے کے علاوہ گھر میں حقہ بھی خوب پیتا تھا۔ آخر کار جب دل کی بیماری کا پہلا حملہ ۱۹۵۹ء میں ہوا تو ڈاکٹروں نے اس بری عادت کو بالکل ترک کر دینے پر زور دیا۔ لیکن یہ میری ایک ایسی کمزوری بن چکی تھی کہ جس کو دور کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

چنانچہ اس بری عادت سے بچنے کے لئے میں بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگا۔ میری پرارتھنا سنی گئی اور راجپور میں ایک ایسا ڈاکٹر آ گیا جو قدرتی طریقو سے خطرناک سے خطرناک اور پرانے امراض کا علاج کرتا تھا میں بھی اس کے پاس پندرہ دنوں تک رہا اور اس دوران میں صرف لیموں کا پانی اور سنگترے کا رس پیتا رہا۔ جب جا کر اس بری عادت سے چھٹکارا حاصل ہوا۔

جھوٹ بولنا۔ چوری کرنا۔ کسی کو دھوکہ دینا۔ اور چائے سگریٹ یا شراب

پینے کا عادی ہو جانا۔ نیز اپنی نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نیک و بد کی تمیز کو
کھو بیٹھنا یہ سب بُری عادتیں ہیں ہر آدمی ان عاداتِ بد سے چھٹکارا حاصل تو
کر سکتا ہے لیکن اس کام کے لئے بہت مضبوط قوتِ ارادی (WILL POWER)
کی ضرورت ہے اپنی بُری عادتوں کے باعث ہی انسان اپنے دوستوں. واقف کاروں
اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے۔ اس باب میں نیچے ایسے ہی اشخاص
کا ذکر ہے جو کافی ذہین۔ محنتی اور صحت مند ہیں لیکن اپنی بری عادات کے باعث
زندگی کے ہر قدم میں ناکامی اور پریشانی کا مُنھ دیکھتے رہے اور نہ تو اپنے رشتہ داروں
اور واقف کاروں کی نگاہوں میں عزت پا سکے اور نہ ہی لوگوں میں اچھی شہرت
حاصل کر سکے۔

(پنڈت خوشدل)

خطرہ ہے

نہ دیوانوں سے خطرہ ہے نہ فرزانوں سے خطرہ ہے
وطن کو خود غرض عیاش انسانوں سے خطرہ ہے
نہیں خطرے کا باعث بیچارے مزدور اور مفلس
ہمارے دیش کو نقلی نیتاؤں سے خطرہ ہے
جہاں انسانیت کی روز و شب تذلیل ہوتی ہو
ہمارے دھرم کو اُن دھرم استھانوں سے خطرہ ہے

امر ناتھ

اُس کا پہلا نام امر سنگھ کھنہ تھا۔ کسی زمانے میں اُس نے کیس رکھے ہوئے تھے
اور سردار امر سنگھ کہلاتا تھا جب ۱۹۴۲ء میں میری اُس سے ملاقات شاہو کی گڑھی
(لاہور اور لاہور چھاؤنی کے درمیان ایک چھوٹی سی بستی میں ہوئی) تب یہ ایک کمپنی
کا سکریٹری یا منیجر تھا۔ اُس کی کمپنی کا نام تھا پور ہیلپ ایسوسی ایشن رجسٹرڈ۔

POOR HELP ASSOCIATION (Regd)

میں اُن دنوں لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار "غریب مزدور" نکالتا تھا
جس کا دفتر بھی شاہو کی گڑھی میں تھا ایکدن میں اشتہار حاصل کرنے کی غرض سے
مندرجہ بالا کمپنی میں گیا جہاں امر سنگھ طالب سے ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں یہ تالیف
وتصنیف کا کام کرتا تھا اور دو تین کتابیں اُس کے نام سے چھپ بھی چکی تھیں میں اُس
کے کافی قریب ہو گیا کیونکہ بات چیت کرنے میں یہ شخص بہت ہوشیار تھا اشتہار کی
اُجرت وصول کرنے کے لئے ایکدن جب میں کھنہ جی سے ملنے گیا تو وہاں عجیب منظر
دیکھا۔ سارے دفتر کے کرمچاری پولیس نے گرفتار کر رکھے تھے اور دفتر کا تمام ریکارڈ
پولیس نے اپنی تحویل میں لے رکھا تھا۔ میں نے ایک پولیس افسر سے اس ایسوسی ایشن
کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ ایک فرضی ادارہ ہے اور اس کے مارکان امر سنگھ
کھنہ اور ایک ڈاکٹر صاحب لوگوں کو دھوکا دیکر لوٹ رہے تھے۔ آخر چند شکایات کی بنا
پر پولیس کو حرکت میں آنا پڑا۔ اور یہ چھاپہ مارنا پڑا۔ میں ابھی اُس پولیس افسر سے

کچھ اور دریافت کرنا چاہتا تھا کہ ایک ٹانگے میں امرسنگھ اور اُس کا ساتھی ڈاکٹر آگئے ایک پولیس کرمچاری بھی ان کے ساتھ تھا۔ امرسنگھ نے پولیس افسر سے اجازت لے کر مجھے کچھ دور سے جاکر کہا۔ خوشدل صاحب۔ بے شک میں لوگوں کو ٹھگتا ہوں اور ہر وہ کام کرتا ہوں۔ جس سے روپیہ ملے۔ لیکن میں آپکو اپنا سچا خیر خواہ اور ہمدرد سمجھتا ہوں اور آپکو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے آپکو کبھی نقصان نہ پہنچیگا آپ اس وقت میری ضمانت کا بندوبست کرادیں۔ میں چند دنوں میں روپیہ کا انتظام کر کے اس مقدمے سے نجات حاصل کرلوں گا۔

میں امرسنگھ کی بات چیت اور گڑگڑاہٹ سے متاثر ہوگیا اور ایک دوست کے ذریعہ اُس کی ضمانت کروادی۔ چنانچہ میں اُسے اپنے ساتھ لیکر اپنے گھر پہنچا۔ اور وہاں پتاجی نے جب اُس کے بارے میں پوچھا تو میں نے دیدہ ودانستہ اُن کو کھنہ جی کے بارے میں کچھ نہ بتایا کیونکہ وہ بہت اصول پرست اور سخت آدمی تھے مجھے ڈر تھا کہ اس امر کا علم ہوتے ہی کہ کھنہ صاحب ایک چارسوبیس ٹائپ کا شخص ہے کبھی اُسے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہ دیں گے اور اگر میں نے اس سلسلے میں ضد کی تو مجھے بھی گھر سے نکالنے میں دیر نہ کریں گے چنانچہ میں نے اپنے نئے دوست کا تعارف کراتے وقت پتاجی سے دیدہٗ و دانستہ جھوٹ بولا۔

امرسنگھ ایک ہفتہ تک میرے گھر میں رہا۔ وہ ہر روز صبح مجھ سے آٹھ دس روپے لیکر جاتا اور رات کو میرے پاس آجاتا۔ ایکدن پچیس (۲۵) روپے لیکر گیا اور دو (۲) تین دنوں کے بعد واپس آیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے جھگڑے کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ اور اب وہ کوئی دوسرا دھندا کرے گا میں نے جب اپنے روپے مانگے تو کہنے لگا۔ ورنہ آپ کی عمر بھر خدمت کروں گا اور ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے سب مطلب کے دوست ملے۔ آپ ایک ایسے شخص ہیں جنھوں نے میری

بدنامی کے باوجود میری مصیبت میں میری مدد کی۔ میں آپ کو اپنا سچا دوست بنانا چاہتا ہوں۔ اب میں جہاں کام شروع کروں گا آپکو اطلاع دیدوں گا۔ آپ ضرور مجھ سے ملنے وہاں آئیے گا۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد ایک دن امر سنگھ آیا۔ اور مجھے اپنے نئے دفتر میں لے گیا۔ جو منرنگ میں تھا دفتر کسی پراویڈنٹ کمپنی کا تھا۔ جن کے ڈائرکٹروں میں کئی بارسوخ اشخاص کے نام تھے وہاں ٹھاٹ باٹ۔ میز کرسیاں۔ عمدہ فرنیچر پلنگ الماریاں وغیرہ۔ سب چیزیں کرایہ پر حاصل کی گئی تھیں۔ چند مہینے کے بعد اُس کا وہ کام بھی بند ہو گیا

پھر کھنہ جی نے راوی روڈ لاہور میں ایک فلم کمپنی کھولی۔ میں بھی گاہے بگاہے وہاں جاتا رہتا تھا کمپنی کا کام بھی کچھ عرصے بعد ٹھپ ہو گیا۔ آخر کار اُس نے پُرانی انارکلی میں ایک مکان کرایہ پر لیا اور وہیں سے دوبارہ گرفتار ہوا ایک ٹھٹھی گاؤں کے نمبردار سردار مستان سنگھ نے اُس کی دو ہزار روپے کی ضمانت دی۔ مقدمہ لاہور کے ایک سپیشل مجسٹریٹ شری رام ناتھ تو تھڑا کی عدالت میں لگا۔ دوسری پیشی پر میں بھی عدالت کی کارروائی سُننے جب عدالت میں پہنچا تو دیکھا وہاں امر سنگھ موجود نہیں اُس کا ضامن سردار مستان سنگھ بہت پریشان تھا۔ مجھ سے اُس نے امر سنگھ کی بابت پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ تین چار دن پہلے مجھے ملا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ پیشی والے دن عدالت میں ملوں گا۔ لیکن نہ جانے وہ کہاں ہے اور کیوں آج عدالت میں نہیں آیا۔ عدالت میں جب آواز پڑی تو ملزم کو غیر حاضر پاکر مجسٹریٹ صاحب بہت ناراض ہوئے ضامن کی طرف مخاطب ہو کر بولے " ایک ہفتہ کے اندر اندر ملزم کو پیش کر دو ورنہ زر ضمانت کا دو ہزار روپیہ سرکاری خزانہ میں جمع کروا دو۔ مستان سنگھ اور میں دونوں حیران تھے کہ کھنہ نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا۔

رات کو قریباً دس بجے کھنہ میرے گھر آیا اور کہنے لگا کہ میں نے ایکہزار روپے کا انتظام کر کے اپنے دوست سردار مستان سنگھ کے پاس رکھا تھا تاکہ پیشی والے دن پولیس اور مدعیان کو روپیہ دے کر مقدمے کو ختم کرا دوں لیکن جب میں پرسوں سردار مستان سنگھ سے روپیہ مانگنے گیا تو اُس نے کہا کہ وہ اُس روپے کو خرچ کر چکا ہے۔ امر سنگھ نے مزید بتایا کہ سردار مستان سنگھ کی منت سماجت کرنے پر بھی وہ روپیہ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو میں نے بھی اُسے سبق سکھانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اسی باعث میں آج عدالت میں حاضر نہ ہوا۔ اب سردار صاحب کو دو ہزار روپے ضمانت کے عدالت میں جمع کروانے پڑیں گے میں نے کہا کہ مستان سنگھ کو تو بے شک اپنی کرنی کا پھل مل جائیگا لیکن تم بھی تو مفرور قرار دیئے جاؤ گے کیونکہ یہ مقدمہ تو ختم نہ ہوگا۔ اور پولیس تمہاری تلاش میں رہے گی جس سے تم کوئی اور کام کاج نہ کر سکو گے۔

"کھنہ بولا۔ پنجاب پولیس مجھے گرفتار نہ کر سکے گی مجھے اپنے دماغ پر پورا بھروسہ ہے۔ میں کل صبح ہی پنجاب کی حدود سے باہر چلا جاؤں گا اور پھر کبھی لاہور کا رُخ نہ کروں گا۔ میں نے صورت حالات کا نزاکت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ کہ میری رائے میں تمہارا یہ اقدام خودکشی سے بھی بدتر ہے۔ آخر کب تک پولیس کی نظروں سے چھپے رہو گے ایک نہ ایکدن تو ضرور گرفت میں آؤ گے پھر اس مقدمے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا مقدمہ مفرور ہونے کے الزام میں بھی تم پر چلے گا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا۔ "پنڈت جی اس چھوٹی سی زندگی میں میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے خوب روپیہ کمایا۔ لوگوں کو ٹھگا۔ عیش کی اب زندگی کا دوسرا پہلو بھی دیکھوں گا۔ میں نے اگرچہ کھنہ کو اس ارادے سے باز رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا اور مجھے آخری نمستے کہہ کر چلا گیا ایک ہفتہ کے بعد عدالت میں سردار مستان سنگھ کو پندرہ سو (۱۵۰۰/) روپے جمع کروانے پڑے اور امر سنگھ اشتہاری ملزم قرار دے دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۲ء کا ہے۔

قریباً چھبیس۲۶ سال بعد یعنی ۲۷ دسمبر ۱۹۷۳ء کو میں اپنے دفتر "دیش سیوک" میں بیٹھا اخبار کا کام کر رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا کہنے لگا مجھے پہچانا ؟ میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور تھوڑا سا حافظے پر زور دیا تو بے ساختہ میرے مُنھ سے نکل گیا - امر سنگھ طالب"۔ نہیں جناب امرناتھ کھنہ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد اُس نے مجھے بتایا کہ تقسیم ہندوستان کے بعد اُس کے خلاف مقدمات ختم ہو گئے تھے اور وہ کھُلم کھُلا بمبئی میں اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ ملکر چاک وغیرہ بنانے کا کام کرتا رہا۔ اُس کے کہنے کے مطابق اپنے بزنس میں وہ بہت کامیاب رہا لیکن اُس کے رشتہ دار نے اُس کو کام سے الگ کر دیا اور ہر ماہ پچاس روپے دینے کا وعدہ کیا۔ کھنہ نے مزید کہا کہ "میرا ارادہ ہردوار میں رہنے کا تھا چنانچہ میں ہردوار پہنچ گیا۔ کیونکہ مجھے چند سال پہلے پتہ چلا تھا کہ آپ وہاں رہتے ہیں۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آپ دہرہ دون میں ہیں اور ایک اخبار نکال رہے ہیں چنانچہ میں بھی یہاں آ پہنچا ہوں اب میں یہاں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ پچاس روپے مجھے بمبئی سے ہر ماہ آجائیں گے۔ پچاس ساٹھ روپیہ میں یہاں کام کر کے کما لوں گا اور اس طرح سَو۔ سوا سو روپے میں اپنا گذارہ کر لوں گا۔"

میں نے دریافت کیا کہ زندگی کا دھارا ابھی کچھ بدلا ہے یا وہی پُرانے ڈھرّے پر چل رہے ہو۔ وہ بولا۔ پنڈت جی اب بڑھاپا آ گیا ہے ساری عمر تو گناہوں میں گذاری ہے اب آخری چند سال ایمانداری سے بسر کرنا چاہتا ہوں دنیا میں آپ ہی واحد شخص ہیں جن پر میں بھروسہ کرتا ہوں۔ اسی لئے یہاں پہنچا ہوں ایک آدھ بُری عادت جو مجھ میں ہے وہ بھی آپکی سنگت سے دور ہو جائے گی۔" میں نے مزید پوچھا کہ دہلی میں اپنے چچا سردار دیوان سنگھ سے ملے یا نہیں ؟ وہ چہرے پہ نفرت کے جذبات پیدا کرتے ہوئے کہنے لگا۔" اگرچہ وہ میرا سگا چاچا ہے لیکن میں اُس کی صورت تک نہیں دیکھنا

چاہتا ہے کیوں! میری رائے میں تو وہ بہت مخلص اور بھلا انسان ہے۔" میں نے کہا۔ کھنہ نے کہا پنڈت جی۔ میرا تو وہ رشتہ دار ہے اور میں نے اُسے بہت قریب سے دیکھا ہے میں اُس کے دفتر میں کئی سال تک کام بھی کر چکا ہوں اُس کے دو روپ ہیں آپ نے اُس کا شاید ایک ہی روپ دیکھا ہے جب دوسرا روپ آپ کے سامنے آئیگا تو آپ کو بھی اُس کے نام سے نفرت ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ ابھی تو میں سردار دیوان سنگھ کو ایک بہت اچھا اور مہمان نواز شخص سمجھتا ہوں اور جب کبھی دہلی جاتا ہوں اُسی کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ ہاں اُس کے چند اصولوں سے مجھے اختلاف ضرور ہے لیکن بطور انسان میں اُسے بہت اچھا مانتا ہوں۔ کھنہ بولا۔ میرا خیال ہے کہ سردار صاحب کے اور زیادہ قریب ہونے سے آپکی رائے بھی میری جیسی ہو جائے۔ خیر چھوڑیئے۔ اس قصے کو۔

آپ بیشک اُن سے اپنے تعلقات بنائے رکھیں۔ لیکن میری بابت اُن کو نہ کچھ لکھنا اور نہ کچھ کہنا۔ میں اُن سے ہرگز ہرگز ملنا نہیں چاہتا۔

خیر کھنہ۔ میرے یہاں رہنے لگا۔ کے میں نے ایک مہینہ میں اندازہ کر لیا کہ اُس کے خیالات میں برائے نام ہی تبدیلی آئی ہے کیونکہ وہ مجھے تگڑم بازی اور بلیک میل کرنے پہ زور دینے لگا۔ جب میں نے سختی سے اُسے ایک دوبار ڈانٹا تو اُس نے مجھے دولت کمانے کے ڈھنگ بتانے چھوڑ دیئے۔

وہ میرے پاس قریباً چھ سات ماہ تک رہا۔ اس دوران میں صرف ۱۳۰/- ایکسو تیس روپے اُس کے بھائی نے بمبئی سے بھیجے اور یہ اُس کا ایک ماہ کا خرچ تھا باقی اُس کا سارا خرچ مجھے برداشت کرنا پڑا۔ میرے دو تین دوستوں (شری شنکر سروپ بھٹناگر مفتوں اور شری یگیہ دلکیہ دت) نے کئی بار مجھ سے کہا کہ جب کھنہ جی کوئی کام نہیں کرتے تو آپ کب تک زیر بار

ہوتے رہیں گے۔

لیکن میں اس خیال میں رہا کہ شاید وہ اپنی عادتوں میں سُدھار کر لے اور حق حلال کی کمائی کرنے پر رضامند ہو جائے۔ آخر جب میں اُس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تو اُسے رشی کیش میں اپنے ایک دوست لالہ بشیشر ناتھ اگروال منیجر گنگا چھتر منی کی رہتی کے پاس چھوڑ آیا۔ وہاں کھنہ نے جیوتش کاریالیہ کھول دیا۔ لیکن وہاں بھی ناکام رہا۔

جون ۱۹۵۰ء کے پہلے ہفتہ میں جب میں دہلی گیا تو سردار دیوان سنگھ کے ہاں ٹھیرا۔ سردار صاحب نے بتایا کہ انھوں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ اس سال کے خاتمہ پر یعنی دسمبر کو اخبار ریاست بند کر کے خود کانگڑہ چلے جائیں گے اور اپنی آخری عمر وہیں گذاریں گے۔ میں نے اُنھیں رائے دی کہ کانگڑہ جانے کی بجائے وہ اپنا آئندہ جیون راجپور دہرہ دون میں گذاریں۔ وہ اس امر پر رضامند ہو گئے کہ وہ راجپور آئیں گے اور اگر اُنہیں یہ جگہ پسند آئی تو وہ کانگڑہ جانے کا ارادہ تبدیل کر دیں گے اور راجپور ہی میں اپنی باقیماندہ زندگی بسر کریں گے۔

رات کو ایک ایک پیگ پینے اور کھانا کھانے کے بعد گپ شپ ہوتی رہی۔ باتوں باتوں میں امر سنگھ کا ذکر آگیا تو میں نے اُنھیں بتایا کہ وہ قریباً سات ماہ سے میرے پاس ہے۔ وہ بولے۔ آپ نے مجھے اُس کی بابت کیوں نہیں لکھا تو میں نے عرض کیا کہ اس امر کے لئے مجھے کھنہ نے یعنی امر سنگھ نے منع کر دیا تھا۔ سردار صاحب ایک منٹ کی خاموشی کے بعد بولے۔ "اچھا۔ میں جب دہرہ دون آؤں گا تب تو اُسے ملوا دوگے۔؟" "ضرور۔ میں نے یقینی لہجے میں کہا۔

میں دہلی سے واپس آکر رشی کیش گیا تو کھنہ کو سردار دیوان سنگھ سے اپنی بات چیت سُنائی۔ لیکن وہ اپنے چاچا سے ملنے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر میرے

بہت کچھ کہنے سننے کے بعد وہ اس امر پر راضی ہو گیا کہ وہ سردار دیوان سنگھ سے ایکبار مل لے گا۔ لیکن اُن کے ساتھ راجپور میں رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ وہ پھر کریگا۔ ۱۶ ارجون ۱۹۵۹ء کو جب سردار دیوان سنگھ دہرہ دون پہنچے تو مَیں امرناتھ کھنہ اور اپنے ایک دوست کے ساتھ اُن کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ چاچا اور بھتیجے میں پچیس تیس سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ چنانچہ ریلوے پلیٹ فارم کے ویٹنگ روم میں دونوں کافی دیر تک آپس میں بات چیت کرتے رہے۔ مَیں سردار صاحب کو راجپور لے گیا۔ اور اُنھیں ایک دو مقامات دکھائے راجپور کی بستی اُنھیں پسند آگئی اور ایک کاٹیج کرایہ پر لے دینے کے لئے مجھے کہکر وہ دہلی واپس لوٹ گئے۔ مَیں نے کاٹھ بنگلہ کے قریب ایک کاٹیج کا بندوبست سردار دیوان سنگھ کے لئے کر دیا اور وہ مستقل طور پر یہاں رہنے کے لئے آگئے کھنہ نے بھی اُن کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ دونوں چاچا اور بھتیجے راجپور میں رہنے لگے۔ کھنہ نے سردار دیوان سنگھ کو بتایا کہ وہ جیوتش ودیا میں ماہر ہو چکا ہے اور اگر وہ دہرہ دون میں اپنا کام شروع کرے تو پانچ صدروپے ماہوار کما سکتا ہے سردار صاحب نے اپنے بھتیجے کو جیوتش کاریالیہ کھولنے کے لئے روپے دینے کا وعدہ کر لیا۔

ایکدن کھنہ میرے دفتر میں آیا تو بولا " مَیں سردار جی سے یکصد روپیہ اپنے جیوتش کاریالیہ کے فرنیچر کے لئے لایا تھا لیکن وہ رقم میں نے اپنے ایک قرض خواہ کو دیدی ہے آپ جب شام کو راجپور جائیں تو سردار جی سے کہنا کہ مَیں نے اس رقم سے کھنہ کو فرنیچر خرید دیا ہے

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کھنہ نے چکروتہ روڈ پر ایک ہندی اخبار چیتاؤنی کے دفتر میں اپنا جیوتش کاریالیہ کھولنے کا بندوبست کر لیا تھا اور مالک اخبار کی سردار

دیوان سنگھ سے ملاقات بھی کروادی تھی چنانچہ مبلغ ایکسو روپے ۱۰۰/- سردار صاحب نے کھنہ کو اس لئے دیئے تھے کہ وہ میرے مشورے سے اپنے جیوتش کاریالیہ کے لئے کچھ فرنیچر خرید سکے۔

میں نے کہا کہ تم اپنے اور سردار صاحب کے درمیان مجھے کیوں گھسیٹتے ہو روپیہ اُنھوں نے دیا۔ تم نے اُسے خرچ کیا۔ میں کیوں کہوں کہ میں نے اُس رقم سے تم کو فرنیچر خرید دیا ہے۔ امرناتھ اس بات پر ناراض ہو گیا۔ کہنے لگا میں تو سردار صاحب سے اس بہانے روپیہ اینٹھنا چاہتا تھا لیکن تم میرے راستے میں روڑے بن رہے ہو۔ اس لئے میں نے اب طے کر لیا ہے کہ دیوان سنگھ سے تمہارا پتہ ہی کاٹ دوں گا۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ میں تمہاری خاطر جھوٹ نہ بولوں گا۔

امرناتھ نے جو کہا تھا کر دکھایا یعنی سردار دیوان سنگھ کے کانوں میں میرے خلاف ایسا زہر بھرا کہ وہ مجھ پر بلیک میل کرنے کے الزامات لگانے لگے۔ میں نے جب سختی سے اُن الزامات کی تردید کی اور اُنہیں چیلنج کیا کہ وہ ایک بھی واقعہ اگر ثابت کر دیں تو میں ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں لیکن سردار دیوان سنگھ اپنی چھوٹی ضد پہ اڑے رہے — اور اپنے بھتیجے کو "درویش" سمجھکر اُس کی باتوں کا یقین کرتے رہے۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے سردار دیوان سنگھ سے بول چال بند کر دی۔ میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ وہ امرناتھ کے دل کی بات کسی طرح سردار صاحب پر واضح کر دے۔ بہت جلد قدرت نے وہ موقع مہیا کر دیا۔ سردار دیوان سنگھ نے اپنا کچھ سامان دہلی سے لانے کے لئے امرناتھ کو دہلی بھیجا۔ چونکہ راجپورہ میں کئی اشخاص سے نقد روپے لیکر وہ جوئے میں ہار بیٹھا تھا اس لئے دہلی کی

اُس نے سامان تو اپنے چاچا صاحب کا بھیجدیا لیکن خود نہ آیا۔ چند دنوں کے بعد دو تین دوکانداروں (شانتا ٹی اسٹال راجپور۔ اور ورما اسٹور ریلیٹن بازار وغیرہ) نے مجھے بتایا کہ کھنہ اُن سے اُدھار لیکر غائب ہے یہ بات جب میں سردار دیوان سنگھ کے نوٹس میں لایا تو انھوں نے شانتا ٹی سٹال کے مالک کا روپیہ تو ادا کردیا لیکن اپنے بھتیجے کو بھی لکھدیا کہ وہ آئندہ اُنھیں اپنی صورت کبھی نہ دکھائے۔

میرا خیال تھا کہ پچیس چھبیس سال کے عرصہ میں امر سنگھ نے کافی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اُس نے اپنی بدعادات کو ترک کر دیا ہوگا اور ایک اچھی اور سادہ زندگی گزارنے کا ارادہ کرلیا ہوگا۔ لیکن افسوس اس نے اپنی بُری عادتوں سے چھٹکارا حاصل نہ کیا۔ اور اس بڑھاپے میں بھی اُسے کہیں ٹھکانا نہ مل سکا۔

اگر اُس نے اپنی بدعادات کو ترک کر دیا ہوتا تو یقیناً کئی اُسے یہاں کسی اچھے کام پر لگا دیتا اور اگر وہ کام کرنا بھی نہ چاہتا تو بھی اپنے چاچا سردار دیوان سنگھ کے پاس رہ کر اپنی باقیماندہ زندگی آرام سے گزار سکتا تھا اور وہ کھانے اور کپڑے کی فکر سے بے نیاز رہتا۔ لیکن افسوس اُس نے اپنے خیالات بد میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ اور اس بوڑھی عمر میں بھی ذلالت اور رُسوائی کا مُنھ دیکھ رہا ہے۔ دہلی سے اطلاع ملی تھی کہ اُس نے شاہدرہ میں پھر اپنا جیوتش کاریالیہ کھول کر لوگوں کو ٹھگنا شروع کر دیا ہے میں کئی بار دھلی گیا ہوں لیکن امرناتھ سے ملنے کا مجھے خیال تک نہیں آیا۔ اور نہ اُس کی ذات سے اب مجھے کوئی دلچسپی رہی ہے بھگوان اُس کی حالت پر رحم کرے اور اُسے نیک عقل بخشے۔

بابورام

میری ملاقات بابورام بھاردواج سے ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ اُن دنوں وہ لاہور میں دو دیگر اشخاص کے ساتھ مل کر ایک فرضی فرم بنا کر جادو کی انگوٹھی اور جنتر منتر سپلائی کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے جب اُسے ایک مقدمہ میں پھنسانا چاہا۔ تو یہ میرے پاس پہنچا۔ میں نے انچارج تھانہ پولیس لاہور چھاؤنی سے مل کر بابورام کو ان چالاک اور دھوکے باز اشخاص کے چنگل سے بچالیا اور اُن دونوں کو لاہور چھاؤنی سے بھگا دیا کچھ دیر اکٹھے رہنے کے بعد بابورام نے مجھے اپنے گھریلو حالات بتائے اُن دنوں وہ بہت دُکھی تھا اُس کا باپ ایک سیدھا سادہ اور اَن پڑھ آدمی تھا۔ اس لئے اُس کے بھائی یعنی بابورام کے چاچا نے چالاکی سے ساری جائداد اپنے نام لکھوالی تھی۔ اور اپنے بڑے بھائی کو روٹیوں کا بھی محتاج بنا رکھا تھا بابورام نے مجھے مزید بتایا کہ اُس کی شادی تو ہو چکی ہے کہ وہ گونا (مکلاوہ) بھی نہ لا سکتا تھا کیونکہ اُس کے چاچا اُسے ایک پیسہ دینے کو تیار نہ تھا اسی باعث بابورام کو نوکری کی تلاش میں پنجاب آنا پڑا اور لاہور پہنچتے ہی وہ ان چالاک اشخاص کے پنجے میں پھنس گیا۔ جنھوں نے ایک بوگس کمپنی بنا کر بابورام کو اُس کا مالک بنا دیا۔

لیکن باہر سے آنے والا روپیہ وہ خود وصول کرتے۔ اُن دنوں بابو رام کو وہ بیس یا پچیس روپے ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے جب کام چل گیا تو اُن دونوں دھوکے بازوں نے بابو رام کو جیل بھیجنے کا منصوبہ بنایا جس کو میرے ذریعہ سے قدرت نے ناکام بنا دیا اور بابو رام میرے پاس ہی رہنے لگا۔

مجھے اُن دنوں روحیں بُلانے سے کچھ دلچسپی تھی چنانچہ میں اور میرا دوست شام لال اکثر گھنٹوں تک رات کو اسی مقصد کے لئے بیٹھا کرتے تھے ہم دونوں مختلف مہاپرشوں کی روحیں بُلایا کرتے تھے اور اُن سے سوالات پوچھا کرتے تھے ایک تپائی کے گرد ہم دونوں ہاتھ مُنہ دھو کر اور شُدھ وستر پہن کر وہاں بیٹھ جاتے تھے اور اُس تپائی پر اپنے ہاتھ رکھکر کسی مہاپرش کی روح کو وہاں آنے کی پرارتھنا کرتے تھے چند منٹوں کے بعد تپائی حرکت کرنا شروع کر دیتی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جس روح کو ہم نے بلایا ہے وہ وہاں آگئی ہے روح سے سوالات پوچھنے کا ہمارا طریقہ یہ تھا کہ ہر سوال کو ہم میں سے ایک اونچی آواز میں بولتا اور پھر یہ کہتا کہ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو پانچ اشارے دیئے جائیں اور اگر جواب نفی میں ہے تو تین۔ اشاروں سے مطلب تپائی کی ایک ٹانگ کی حرکت سے تھا۔ تپائی کی ایک ٹانگ خود بخود اُوپر اُٹھتی اور پھر نیچے زمین پر گرتی۔ ہم اس کو ایک اشارہ یا سٹروک کہا کرتے تھے (STROKE) میں یہ بات وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ کوئی روح ہمارے بلاوے پر ضرور وہاں آجاتی تھی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے پوچھے گئے سوالات کے جوابات زیادہ تر صحیح ہوتے تھے اور بعض اوقات تو اتنے حیران کُن ہوتے تھے کہ ہمیں بھی پہلے پہل اُن پر یقین نہ آتا تھا ہمارے واقف کار اور دیگر اشخاص ہم سے سوالات پوچھنے میری بیٹھک میں

آیا کرتے تھے اور اکثر مطمئن ہو کر جاتے تھے یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہم سوال پوچھنے والوں سے کوئی پیسہ وغیرہ نہ لیتے تھے یہ کام ہم اپنی روحانی ترقی اور لوگوں کی بھلائی کے لئے کرتے تھے۔

ایکدن ہم حسب معمول تپائی کے گرد بیٹھے لوگوں کے سوالات کے جوابات دے رہے تھے کہ میرا ملنے والا ایک شخص (لالہ گینڈا رام) آیا اور اُس نے بھی ایک سوال پوچھا۔ کچھ دیر کے بعد اس دن کی سٹنگ (SITTING) ختم ہو گئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اُسی شام کو بابورام کو بھی اپنے گاؤں جانا تھا چنانچہ میں نے اُسے کرایہ وغیرہ کے روپے دے دیئے۔ اور وہ رات کی گاڑی سے سوار ہو کر چلا گیا۔ اگلے دن صبح ۹ بجے لالہ گینڈا رام میری بیٹھک میں آیا۔ کہنے لگا۔" پنڈت جی۔ کل جب میں آپ کے کمرے میں اپنا سوال پوچھنے آنے لگا تو میں نے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی اُتار کر باہر والی کھڑکی میں رکھ دی تھی کیونکہ آپ نے کہا تھا کہ چمڑے کی کوئی چیز اندر کمرے میں نہ لانی چاہئیے لیکن وہ گھڑی وہاں سے اُٹھانا بھول گیا اب وہ وہاں نہیں ہے دھیان رہے کہ جس کمرے میں ہم روحیں بلایا کرتے تھے اُس کمرے میں نہا دھو کر یا منہ ہاتھ دھو کر ننگے پاؤں داخل ہوتے تھے اور اپنے جسم پر چمڑے کی کوئی چیز نہ رکھتے تھے اسی لئے لالہ گینڈا رام کو بھی اپنی گھڑی باہر رکھنے کے لئے کہا تھا گھڑی کی گمشدگی کی بابت سُنکر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ آج تک میری بیٹھک سے کوئی چیز اس طرح گم نہ ہوئی تھی کچھ دیر غور کرنے کے بعد مجھے یاد آ گیا کہ کل کی بیٹھک یعنی سٹنگ (SITTING) میں ایک ایسا بھی ہمارا دوست شریک ہوا تھا جو چوری کرنے اور جھوٹ بولنے کو پاپ نہیں مانتا۔ میں اُس کے مکان پر گیا اور اُس سے گھڑی کی بابت دریافت کیا اُس نے قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ گھڑی

اس نے نہیں اُٹھائی۔ اس نوجوان کے علاوہ باقی چار پانچ اشخاص جو سوالات پوچھنے آئے تھے اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا کہ جس پر میں گھڑی کی چوری کا شک کرتا۔ اس لئے گھڑی کا گم ہونا میرے لئے بہت پریشان کن مسئلہ بن گیا۔

رات کو شام لال آیا تو اُسے میں نے گھڑی کی گمشدگی کی اطلاع دی۔ دن بھر کی اپنی دوڑ دھوپ کی بابت بھی بتا دیا لیکن گھڑی کا سراغ نہ مل سکا۔ شام لال نے پوچھا۔ "بابو رام تو یہ کام نہیں کر سکتا۔" "ہرگز نہیں" میں نے زوردار الفاظ میں کہا۔ "وہ اگرچہ دھوکے باز لوگوں کے ساتھ کچھ عرصہ تک رہا ہے لیکن جھوٹ بولنے کے علاوہ اور کوئی بری عادت اُس میں نہیں آئی۔ نیز میں نے جب اُسے کرایہ وغیرہ کے لئے روپے دے دیئے تھے تو اسے گھڑی لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر گھڑی بھی میری نہیں بلکہ میرے ایک گھر سے واقف کار کی۔ ہم ابھی اس سلسلہ میں بات چیت ہی کر رہے تھے کہ ہمارا وہی دوست آ گئے جو اپنی مطلب برآری کے لئے چوری کرنے اور جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے تھے۔ کہنے لگے۔ کیوں نہیں کسی روح کو بلا کر اُس سے یہ سوال پوچھ لیتے۔ شاید گھڑی کا کچھ سراغ مل جائے۔ ٹھیک میں نے کہا۔ چنانچہ میں نے اور شام لال نے ہاتھ منہ دھو کر تپائی پر ہاتھ رکھے اور ایک روح کا دھیان کر کے اُس سے درشن دینے کی پرارتھنا کی۔ جتنے آدمی کل کی مجلس میں شریک تھے سب کے نام پر اشارے مانگے لیکن تپائی نے تمام جوابات نفی میں دیئے۔ سب سے آخر میں بابو رام کے متعلق پوچھا تو تپائی کی ایک ٹانگ نے اثبات میں جواب دیا۔ ہم تینوں اس بات پر دنگ رہ گئے۔ خاص طور پر مجھے تو وشواش ہی نہ ہوتا تھا کہ بابو رام یہ کام کر سکتا ہے اور میرے ہاں سے کوئی چیز چرا کر لے جا سکتا ہے دوبارہ جب روح سے یہ سوال پوچھا گیا تو پھر یہی جواب ملا کہ بابو رام نے گھڑی اُٹھائی ہے چنانچہ وہ شنگ

ہم نے ختم کر دی اور اگلے دن میں نے بابورام کو خط لکھا کہ گھڑی کی چوری کا الزام ایک مقدس روح نے تم پر لگایا ہے اس لئے اس سلسلے میں سچی سچی بات فوراً لکھ دو۔

چند دنوں کے بعد بابورام کا جواب آ گیا جس میں اس نے تسلیم کیا کہ وہ گھڑی اٹھا کر لے گیا تھا تاکہ گاؤں والوں کو اپنی شان دکھا سکے اور جب واپس آئیگا تو وہ گھڑی ضرور لیتا آئیگا۔ ہم نے اگلے دن پھر جب ایک روح سے بابورام کے جواب کے متعلق پوچھا تو جواب ملا کہ یہ گھڑی بابورام واپس نہ لائے گا۔ یہ بات بھی میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کیوں وہ گھڑی بابورام واپس نہ لائے گا لیکن دو تین ہفتوں کے بعد جب بابورام واپس آیا تو واقعی وہ گھڑی واپس نہ لایا بلکہ اُس نے بتایا کہ وہ گھڑی اُس سے کہیں گم ہو گئی تھی۔ چنانچہ لالہ گینڈا رام کو اُس گھڑی کی قیمت مجھے ادا کرنی پڑی

بابورام کو اُس کے چاچا سے جائداد کا حصہ دلانے کے لئے مجھے کیا کچھ کرنا پڑا یہ ایک لمبی داستان ہے لیکن میں اُس کام میں کامیاب رہا اور ایک دن بابورام اپنے حصے کے علاوہ اپنے چاچا کے حصے کا مالک بھی بن بیٹھا۔ کیونکہ اُس کے چاچا کی موت واقع ہو گئی۔ اب بابورام کے ہاتھ میں کافی روپیہ آ گیا جس سے اُس کی ذہنیت ہی بدل گئی۔ اور وہ خوب کھُل کھیلا۔ کہاں تو روپیہ حاصل ہونے سے پیشتر میرے ساتھ بیٹھ کر لمبی چوڑی اسکیمیں بنایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ روپیہ ہاتھ آتے ہی دونوں اکٹھے مل کر کام کریں گے اور اب میری مالی مدد کرنا تو درکنار میرے خطوط کا جواب تک بھی نہ دیتا۔ چنانچہ میں نے بھی اُس سے خط و کتابت بند کر دی۔

۱۹۴۴ء میں جب میں ایک لمبے عرصہ تک بخار میں مبتلا رہا تو ریشی کیش کے ڈاکٹروں نے مجھے تبدیل آب و ہوا کا مشورہ دیا اُن دنوں مالی حالت میری بہت

ہی خراب تھی اس لئے بغیر پیسے کے کہاں جاتا۔ تب مجھے بابو رام کی یاد آئی۔ یہ
اُن دنوں بالا والی گاؤں میں ڈاکٹری کی پریکٹس کیا کرتا تھا۔ ایکدن میں بغیر اطلاع
دیئے اپنی دھرم پتنی اور گھر بلو نوکر دولت رام کو ساتھ لیکر بالا والی پہنچ گیا۔
بابو رام سے ملا۔ وہ اپنے بے رُخی کے لئے معذرت کرنے لگا۔ اور اُس نے بتایا کہ اُس نے
ایک واقف کار کے ساتھ ملکر ایک کارخانہ لگایا تھا۔ جس میں سب روپیہ ضائع
ہو گیا۔ میں چُپ چاپ اُس کی باتیں سُنتا رہا اور اُس کی طوطا چشمی اور وعدہ
خلافی کے لئے کچھ نہ کہا۔ خیر میری رہائش کا بندوبست اُس نے ایک دھرم شالہ
میں کر دیا جو اُس کے مکان کے نیچے تھی۔ مجھ سے کھانے کے لئے پوچھا تو میں نے
بتایا کہ میں تو مونگ کی دال یا آلو کی یا ٹنڈے کی سبزی ہی لیتا ہوں۔ وہ سبزی
لانے کے لئے چلا گیا۔ اور ایک گھنٹہ کے اندر کھانا دینے کا وعدہ کر گیا۔ جب دو گھنٹہ
تک بابو رام نہ آیا تو میں اوپر اُس کے گھر گیا اُس کی بیوی سے کہا کہ مجھے تو بھوک
لگی ہے جو کچھ گھر میں موجود ہو وہی دیدو۔ وہ بولی۔ یہاں تو گھر میں نہ آٹا ہے
نہ دال۔ ڈاکٹر صاحب سبزی لینے گئے ہیں وہ جب سبزی لے آئیں گے تب آٹے
وغیرہ کا بھی بندوبست کریں گے۔ پھر روٹی مل سکے گی۔ میں اُس عورت کا یہ جواب
سُنکر حیران رہ گیا۔ کیونکہ اس عورت کو میں نے بابو رام کے ساتھ لاہور چھاؤنی میں کئی
ماہ تک رکھا۔ اور اُن کے کھانے پینے کا خرچہ اُٹھاتا رہا تھا۔ آج یہ ایک وقت کا
کھانا بھی کھلانے سے انکار کر رہی تھی چونکہ بیماری کے باعث میرا مزاج چڑچڑا ہو
گیا تھا۔ اور برداشت کا مادہ بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ اس لئے میں بابو رام کی دھرم پتنی
(جس کا نام گنگا دیوی تھا) کے اس سلوک پر بھڑک اُٹھا اور اُسے کافی جلی کٹی سنائیں
کچھ دیر تک وہ چپ چاپ سنتی رہی پھر یکایک غصہ سے بولی۔ "جب آپ پر مصیبت
پڑی تو ہم نے آپکی امداد کی تھی۔ اب ہم مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں تو آپ ہمارے

روپئے بھی نہیں دیتے۔ مَیں نے گرج کر کہا۔ "کون سے روپئے؟" وہ بولی وہی ایکہزار روپے جو ڈاکٹر صاحب نے آپکو چھ ماہ پہلے بھیجے تھے۔ مَیں غصّہ سے پاگل ساہو اُٹھا۔ اور چلایا۔ "یہ بالکل بکواس اور جھوٹ ہے ڈاکٹر صاحب نے ایکہزار روپے تو کیا ایکہزار پیسے بھی مجھے نہیں دئیے۔ وہ حیرت سے میرا مُنھ تکنے لگی۔ کچھ نرم ہو کر بولی۔ تو کیا آپکو ڈاکٹر صاحب نے کوئی روپیہ اُدھار نہیں دیا۔" بالکل نہیں" مَیں نے کہا۔ اس شخص نے تو مجھے خط کا جواب تک بھی نہ دیا۔ روپیہ بھیجنے کا کیا سوال ہے اب وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگی" مجھ سے تو اُنھوں نے کہا تھا کہ پنڈت جی کو اپنی فارمیسی کے لئے روپے کی ضرورت ہے اس لئے مَیں نے اُن کو ایکہزار روپے بطور قرض دیئے انہیں اب جب ہمارا کام بند ہو گیا تو مَیں نے اُن سے کہا کہ پنڈت جی کو روپے واپس کرنے کے لئے لکھو۔ تو مجھے کہتے تھے کہ کئی خط پنڈت جی کو لکھے ہیں لیکن وہ نہ تو روپیہ واپس بھیجتے ہیں اور نہ خط کا جواب دیتے ہیں" گنگا دیوی کے اس انکشاف پر غصے کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا تھا اس لئے مَیں نے اُس سے کہا کہ اب میرے لئے تمہارے گھر کا پانی پینا بھی حرام ہے بھگوان خود میرے لئے یہاں بھی کوئی راستہ نکال دے گا۔ بابو رام آئیگا تو اُس کے سامنے تم سے بات کروں گا۔ یہ کہکر مَیں نیچے دھرم شالہ میں چلا آیا اور اپنی دھرم پتنی کو ساری بات چیت بتادی۔ وہ بھی اُسے سُنکر سخت حیران ہوئی اور بابو رام کے اس جھوٹ پر اُسے بھی سخت رنج ہوا۔

دو دن تک بابو رام گھر سے غیر حاضر رہا اُس کا خیال تھا کہ بالا والی میں میرا کوئی واقف کار نہیں اس لئے اُس کی غیر حاضری کے باعث مَیں واپس رشی کیش چلا جاؤں گا لیکن بھگوان نے مجھے وہاں ایک ایسے شخص (شری بلدیو سہائے جی جو آج کل گنگا گلاس فیکٹری میں لیبر افسر ہیں) سے ملا دیا۔

جن کی بدولت میں وہاں دس بارہ دنوں تک رُکا اور آج تک بلین صاحب کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ تیسرے دن جب بابورام واپس گھر آیا اور مجھے ملا تو میں نے اُس سے غصہ میں پوچھا کہ کب تم نے مجھے ہزار روپے بھیجے تھے وہ شرمندہ ہو کر بولا "خوشدل" بات یہ ہے کہ میں نے ایک بزنس میں نقصان اُٹھایا تھا اور اپنی وائف سے جھوٹ بول دیا کہ ایکہزار روپے میں نے خوشدل کو بطور قرض دیئے ہیں کیونکہ یہ روپیہ میں نے زیورات گروی رکھکر حاصل کیا تھا۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "تمہیں شرم آنی چاہیئے تھی۔ کہ تم نے اپنی بیوی کی نگاہوں میں میری پوزیشن خراب کر دی۔ تمہارے پاس اتنا روپیہ آیا لیکن تم نے میری کچھ مدد کرنے کی بجائے مجھے اُلٹا اپنے رشتہ داروں میں بدنام کر دیا۔ آج کے بعد میں تم سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس سے پیشتر تمہیں اپنی دھرم پتنی کو میری موجودگی میں یہ بتانا ہوگا کہ تم نے مجھے قرضہ دینے کی بات اس سے جھوٹ کہی تھی چنانچہ بابورام میرے غصے کو دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچا اور اپنی بیوی کے سامنے یہ مان گیا کہ اُس نے مجھے کوئی قرضہ نہیں دیا اور اُس نے اس سلسلہ میں بالکل غلط بیانی کی تھی اُس کی بیوی (گنگا دیوی) نے بھی بابورام کو خوب لعن طعن کی اور مجھ سے اپنی گستاخی اور بے رُخی کی معافی مانگی۔ مگر اب میرا دل ان دونوں سے سخت متنفر ہو چکا تھا۔ اور میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ان سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ چنانچہ بالا والی سے واپس آتے وقت نہ تو میں بابورام سے ملا اور نہ اُس کی دھرم پتنی سے۔

دو تین سال کے بعد ہردوار میں ایکدن بابورام میری فارمیسی واقع

میمی ہاؤس پر آگیا اور بولا کہ اُسے اُس کی غلط بیانی کے لئے معاف کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اب معاملہ ختم سمجھو۔ تم اپنے گھر راضی میں یہاں خوش۔ وہ بولا کہ میری دھرم پتنی کی مرتیو ہو چکی ہے اور میں ایک دوسری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تمہاری امداد کی ضرورت ہے پہلے تو میں انکار کرتا رہا لیکن جب یہ بہت زیادہ گڑگڑایا تو میں مان گیا۔ چنانچہ میں نے دوسری شادی کے لئے اُس کی مدد بھی کی۔ بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ بابو رام بالا والی کو چھوڑ کر اپنے گاؤں سسونہ چلا گیا ہے۔ اور وہیں ڈاکٹری کی پریکٹس کر رہا ہے ڈاکٹری اس نے کہاں سے سیکھی یا پڑھی اس کا مجھے علم نہیں۔ سُنا ہے کچھ عرصہ تک کسی ڈاکٹر کے ہاں کمپونڈر کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد خود اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ اس قسم کے ڈاکٹر سب جگہوں پر ملتے ہیں اور یہ بھی اُن میں سے ایک ہے دو سال ہوئے بابو رام اپنے ایک کام کے لئے دہرہ دون آ کر مجھے ملا۔ اگرچہ میرے دل میں اُس کے لئے اچھے جذبات نہ تھے لیکن میں نے اُس کا کام کروا دیا۔ اُس کی بات چیت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہی اُس کی عادت غلط بیانی اور لمبی چوڑی اسکیمیں بنانے کی ہے حالانکہ مجھ سے دو تین سال ہی عمر میں چھوٹا ہے اور اُس کے لڑکے لڑکیاں بھی جوان ہیں لیکن بابو رام کی باتوں میں نہ تو سنجیدگی آئی ہے اور نہ اُس کے ارادے میں پختگی۔ یہ سب بُری عادتوں کا نتیجہ ہے دھارمک خیالات رکھنے کے باوجود یہ شخص اپنی جھوٹ بولنے کی عادت اور حد سے زیادہ خود غرضی کے باعث اپنے گاؤں والوں کی نظروں میں بھی اچھا مقام نہیں پا سکا

حساس طبیعت والا ہی مانے گا کسی کے احسان کو
بے حس، بے غیرت۔ بد فطرت شرمندہ احسان کیا ہو گا

وجے سنگھ

یہ واقعہ ایک ایسے شخص کے متعلق ہے جو بہت محنتی اور دھارمک خیالات رکھتا تھا لیکن نہ جانے اس کے دماغ میں کبھی کبھی کیا سنک اٹھتی کہ وہ اپنے دھارمک خیالات کو بھول کر چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا اس کی بات چیت سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ شخص کسی کو دھوکہ دے سکتا ہے یا کچھ نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جہاں جہاں بھی رہا وہیں سے چوری کرکے فرار ہوا آج کل کہاں ہے اس کا مجھے علم نہیں آخری بار یہ دہرہ دون میں ۱۹۵۳ء میں ملا تھا۔

۱۹۴۶ء میں جب میں رشی کیش میں رہ رہا تھا اور آریو ویدک ادویات بیچکر اپنے بال بچوں کا گزارا کر رہا تھا ایکدن ایک شخص میری دوکان (سیبک فارمیسی) واقعہ ریلوے روڈ پر آیا اور کہنے لگا۔

" بابو جی ڈیڑھ دن کا بھوکا ہوں کہیں کچھ کام دلا دو میں بولا " ارے کم بخت رشی کیش میں آ کر بھی تو بھوکا رہ رہا ہے یہاں اتنے انچھتر ہیں کہیں جا کر روٹی مانگ لے اور اپنا پیٹ بھر لے " اس نے ذرا گمبھیر ہو کر کہا مہاراج جی بھیک مانگنا تو بہت شرمناک کام ہے کوئی اپاہج یا کوڑھی بھیک مانگے تو کوئی حرج نہیں لیکن مجھ جیسا ہٹا کٹا آدمی اگر دان مانگے تو شرم کی بات ہے" مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی کیونکہ میرے خیالات کے مطابق تھی۔ چنانچہ میں نے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے

پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو۔ وہ بولا۔" میرٹھ کے
قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام وجے سنگھ ہے تھوڑی سی ہندی
لکھ لیتا ہوں اور مزدوری کا ہر کام کر سکتا ہوں۔ اچھا میں تمہارا بندوبست ضرور
کر دکھاؤں گا، اس نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔ بتائیے میرے لئے کیا کام ہے؟
میں تمہیں ایک کلہاڑی لیکر دیتا ہوں" تم جنگل سے لکڑیاں کاٹ لایا کرو۔ اور
اُسے بازار میں بیچکر اپنا خرچہ چلاؤ۔ رہنے کے لئے میری دوکان حاضر ہے یہاں
سو یا کرو۔

وہ مان گیا اور میں نے اگلے دن اُسے ایک کلہاڑی خرید دی اور جنگل سے
لکڑیاں کاٹ لانے کا پروانہ لے دیا لیکن چار پانچ دنوں کے بعد ہی اُسے بخار
آنے لگا۔ اور وہ سارا دن دوکان پہ پڑا رہنے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ میں نے اس
کے کھانے کا انتظام اپنے گھر ہی میں کر دیا اور وہ میرے دوسرے نوکر (دوت رام)
کے ساتھ دوکان کی صفائی اور دیکھ بھال میں ہاتھ بٹانے لگا۔

کچھ عرصہ کے بعد میری دوسری دھرم پتنی کی ماتا جی رشی کیش آئیں اور
چند دن ہمارے پاس رہ کر جب واپس راولپنڈی جانے لگیں تو ہم اُنھیں ہردوار
تک چھوڑنے گئے وجے سنگھ نے بھی ہردوار جانے کی خواہش ظاہر کی اور ہم نے
اُسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ ہردوار پہنچکر ہم نے ایک دھرم شالہ میں ڈیرہ
لگایا اور اگلے دن ماتا جی کو پنجاب جانے والی گاڑی پر سوار کرا کر رشی کیش
آنے کا پروگرام بنایا۔

شام کو گنگا جی کے پلیٹ فارم پر گھومنے کے لئے نکلے۔ رات کا کھانا ایک
ڈھابے (سری) میں کھا کر ہم دھرم شالہ کی جانب جا رہے تھے کہ بھلہ پارک
کے قریب ایک شخص نے میرا نام لے کر پکارا جب وہ قریب آیا تو میں نے اُسے

پہچان لیا وہ بابا کالی کملی والے چھیتر کا سپروائزر شری سوہن لال تھا۔ اُس نے
بتایا کہ اُسے خاص کام کی باعث ہردوار میں رکنا پڑ گیا ہے اور ٹانگہ بالکل
خالی رشی کیش جا رہا ہے اس لئے اگر ہم تانگہ پر رشی کیش جانا چاہیں تو شوق
سے جا سکتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ اس سلسلہ میں میری دھرم پتنی کچھ اپنی
رائے دیتی میں نے جھٹ فیصلہ کر کے یہ حکم لگا دیا۔ ہم دونوں یعنی میں اور میری
دھرم پتنی اس ٹانگے میں رشی کیش جائیں گے۔ اور (وجے سنگھ سے مخاطب ہو کر)
تم کل صبح لاری پر ہمارا بستر وغیرہ اور دیگر سامان (میری ساس نے کچھ برتن
اور دیگر چیزیں بھی خرید کر دی تھیں۔ جن کی مجموعی قیمت ۲۵، ۳۰ روپیہ تھی) لیکر
آجانا یہ کہہ کر میں نے تالے کی چابی اور دو روپے وجے سنگھ کے حوالے کئے
اور تانگہ پر سوار ہو گیا۔

اگلی دوپہر کو جب وجے سنگھ نہ پہنچا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ شام تک انتظار
کرنے کے بعد میں پھر ہردوار گیا اور اُسی دھرم شالہ میں پہنچا معلوم ہوا کہ وجے سنگھ
صبح سویرے وہاں سے جا چکا ہے کچھ دیر کھوج کرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ
کچھ سامان دھرم شالہ کے باہر ایک دوکاندار کے پاس فروخت کر گیا۔ دوکاندار
نے روپے لیکر وہ سامان واپس کرنے کی رضامندی دے دی۔ لیکن میں نے
اس سامان کی ضرورت نہ سمجھی۔ نیز اس وقت میرے پاس اتنے روپے بھی
نہ تھے جو میں اس سامان کی قیمت چکا سکتا۔ چنانچہ آخری بس سے میں
رشی کیش واپس چلا گیا اور گھر والوں کو وجے سنگھ کی کرتوت سے آگاہ کر دیا۔

ایک سال کے بعد پھر وجے سنگھ ہمارے گھر آ گیا۔ اُس نے اپنی حرکت
کے لئے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کوئی شکایت کا موقعہ نہیں دیگا
چنانچہ پھر میں نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ چند دن رہنے کے بعد وہ ایک

دن اپنے کپڑے دھونے کے لئے گنگا جی پر جانے لگا تو اُس نے اصرار
کیا کہ وہ میرے کپڑے بھی دھو لائے گا۔ میری دھرم پتنی نے اُسے میرے
بھی تین چار کپڑے (قمیص، پائجامہ اور دھوتی وغیرہ) دھونے کے لئے
دیدیئے۔ وہ کپڑے لیکر پھر رفو چکر ہو گیا۔ اور ہم پھر درویش بر جان درویش
کے مصداق اپنے دل پر جبر کر کے چپ بیٹھ گئے۔

چند مہینوں کے بعد وہ تیسری بار آدھمکا آتے ہی اس نے میرے پاؤں
پکڑ لئے رو رو کر معافی مانگنے لگا۔ میں کچھ دیر تو سخت بنا رہا لیکن جب اُسنے
بہت گڑگڑا کر معافی مانگی۔ اور اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا اور آئندہ کبھی چوری
کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے پھر اُسے پاس رکھ لیا۔ اُن دنوں مجھے بخار آ رہا تھا
دو تین ماہ سے بخار نے بہت پریشان کر رکھا تھا ڈاکٹروں نے تو تپ دق کہکر
مجھے اپنی زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ لیکن میں بھگوان کے بھروسے جی رہا
تھا مجھے یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ مجھے تپ دق ہے ڈاکٹروں کے زور دینے کے
باوجود میں نے اپنا ایکسرے نہیں کرایا کیونکہ میں سوچتا تھا کہ بالفرض محال
میرے ایک یا دونوں پھیپھڑے اس بیماری کا شکار نکلے تو پھر میری ول پاور
(WILL POWER) کام نہ دے سکے گی ہاں اس امر کا فیصلہ اُن دنوں میں نے
اپنے دل میں ضرور کر رکھا تھا کہ جس دن مجھے یہ یقین ہو گیا کہ میں دق کا مریض
ہوں اُسی دن گنگا جی میں کود کر اپنی زندگی ختم کر لوں گا۔ کیونکہ چار پائی پر پڑے
پڑے مہینوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا اور اپنے بال بچوں کو مزید پریشان
کرنا مجھے پسند نہ تھا۔ یہاں یہ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ قریباً چھ
ماہ تک جب مجھے اس بخار نے خوب رگڑا دیا رشی کیش اور ہردوار میں علاج کروا کر
تنگ آ گیا تو میں دہرہ دون پہنچا۔ وہاں بھائی جی، (مسٹر... خان کھنہ جی جنہوں نے

میری دوسری دہرم پتنی کو بچپن سے اپنی دھرم کی بیٹی منا رکھا تھا نے میرا کافی علاج کروایا۔ آخر جب میں بالکل نا امید ہو گیا اور ایکدن جب میرے دماغ نے بھی یہ مان لیا کہ واقعی تپدق نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے تو اسی رات میں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا پکا ارادہ کر لیا آسے عملی جامہ پہنانا چاہا لیکن قدرت کو ابھی میری موت منظور نہیں تھی اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اسی رات کو میرا بخار اتر گیا اس کے بعد میں نے خوب بدپرہیزی کی اور روز بروز صحت یاب ہوتا گیا۔

میں جب اپنی دھرم پتنی کے ساتھ دہرہ دون آیا اور مسٹر کھنہ کے یہاں رہا۔ تو میری جیب اُن دنوں بالکل خالی تھی۔ میں دولت رام سے کہہ آیا تھا کہ وہ فاریسی کی آمدن سے اپنا اور وجے سنگھ کا گزارا چلائے۔ اگر کچھ بچ جائے تو مجھے بھیجدے۔ دہرہ دون رہتے ہوئے مجھے ایک ماہ کے قریب عرصہ ہو چکا تھا کہ ایک شام وجے سنگھ آ پہنچا۔

اس نے بتایا کہ دولت رام سخت بیمار ہے اور وہ بھی ملیریا کا شکار ہو رہا ہے دوکان سے آمدنی اتنی نہیں ہوتی جس سے دونوں کا گزارا چل سکے اسی لئے وہ آیا ہے کہ میں اُسے کچھ روپیہ دے دوں اور وہ جا کر دولت رام کا علاج کرا سکے جھائی جی سے کچھ روپے لیکر میں نے اُسے دیئے اور وہ چلا گیا۔ لیکن تین چار دنوں کے بعد دولت کے رام کے خط سے پتہ چلا کہ وہ وہاں نہیں پہنچا۔ اور پھر کہیں نہاں گیا ہے۔

آخری بار وجے سنگھ ۱۹۵۰ء میں میرے پاس دہرہ دون آیا اگرچہ

پھر اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور بہت گڑگڑایا لیکن میں نے اپنے جی کو بہت پکا کر لیا اور اپنے پاس رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ آخر جب اُس کا سارا رونا دھونا فضول ثابت ہوا اور اُسے یہ پورا یقین ہوگیا کہ میں آئندہ اُسے کسی صورت میں بھی رکھنے پر رضامند نہیں ہوں تو اس نے کہا۔

"پنڈت جی مجھے دو تین روپے دیدو۔ میں ایک دو دن یہاں کسی دھرم شالا میں رہ کر کہیں اپنے لئے کام تلاش کر لوں گا۔ اس کی یہ درخواست میں رد نہ کر سکا اور اُسے دو یا تین روپے دیدیئے ہفتہ دس دن کے بعد میں ایک دن کچہری جانے کے لئے شرنی مل بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک رنگریز (کپڑے رنگنے والا) کی دوکان سے اُٹھ کر ایک شخص نے میرے پاؤں کو چھُوا۔ میں نے دیکھا کہ دیجے سنگھ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ اس نے دوکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ وہاں نوکری کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا تمہیں یہ کام آتا ہے؟ وہ بولا کام تو مجھے کئی آتے ہیں لیکن قسمت کی وجہ سے دھکے کھا رہا ہوں۔ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اب ایمانداری سے کام کرنا قسمت خود بخود ٹھیک ہو جائیگی۔ اس نے وعدہ کیا اور دوکان پر جا بیٹھا۔ اور میں اپنی راہ چلدیا۔

دو تین ہفتوں کے بعد میرا پھر اُس بازار سے گزر ہوا۔ تو دیجے سنگھ اُسی دوکان پر ملا۔ اس وقت اس کا مالک بھی وہاں بیٹھا تھا وہ بنگالی معلوم ہوتا تھا اس نے دیجے سنگھ کے کام کی بہت تعریف کی۔ لیکن جب میں نے یہ کہا کہ یہ بہت ایماندار ہے تب دل ہی دل میں میں ہنس دیا پھر کچھ دن کے بعد وہ بنگالی رنگریز مجھے بازار میں ملا۔ تو اُس نے

وجے سنگھ کے متعلق میری رائے پوچھی ہیں نے اُسے اس کی گزشتہ
چوریوں کے متعلق اس لئے نہ بتلایا کہ انہیں سُنکر وہ اُسے ایک دم
نوکری سے الگ کر دے گا۔ لیکن یہ ضرور کہدیا " آدمی تو یہ اچھا ہے
لیکن اس پر زیادہ اعتبار نہ کرنا۔ اور نہ ہی نقدی وغیرہ اس کی تحویل میں
دینا۔ خود چوکس رہو چور کسی کو مت کہو"۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اُس نے
کہا کہ وہ اب زیادہ چوکس رہے گا۔ لیکن اُس کی چوکسی کبھی کام نہ آئی اور
ایک ماہ کے بعد وہ بنگالی میرے دفتر میں آکر بتا گیا کہ وجے سنگھ کل
رات سے غائب ہے اور اس کا کچھ سامان بھی لے گیا میں نے اُسے
پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا مشورہ دیا۔ معلوم ہوا کہ اُس نے
پولیس میں رپورٹ درج کرادی۔ اس کے بعد نہ وجے سنگھ کا پتہ لگا اور
نہ اُس رنگریز کا معلوم ہوا کہ وہ دوکان خالی کر گیا ہے اور دوسرے دن
چھوڑ گیا ہے۔

آوازِ حق

حق و نیکی پہ جو مائل نہیں ہے
وہ انساں جینے کے قابل نہیں ہے
تڑپ اُٹھے دُکھی کے جو نہ دُکھ پر
وہ پتھر کا ہے ٹکڑا، دِل نہیں ہے
نہیں راضی خدا کی جو رضا میں
سکونِ دل اُسے حاصل نہیں ہے

خوش رہو

کہہ رہے ہیں چاند سورج اور تارے خوش رہو
گنگا اور جمنا کے بھی کہتے ہیں دھارے خوش رہو

ہے خوشی کا اک سمندر جس کو کہتے ہیں خدا
تم بھی بن جاؤ سمندر کے کنارے خوش رہو

آج تک دھرتی پہ آئے جتنے روحانی بشر
بس یہی فرما گئے سارے کے سارے خوش رہو

جو بھی اس دنیا میں آیا ہے وہ اک دن جائے گا
مست رہ کر دیکھو قدرت کے نظارے خوش رہو

وید کی، قرآن کی، بائیبل کی ہے تعلیم یہ
جیسی حالت میں خدا رکھتا ہے پیارے خوش رہو

مسکراؤ اور لگاؤ قہقہے جی کھول کر
خود بخود دکھ ختم ہو جائیں گے سارے خوش رہو

رونے دھونے چیخنے چلانے سے کیا فائدہ
سیکھو خوش دل سے مسرت کے اشارے خوش رہو

مختلف

واقعات

جرمن کا جاسوس

سنہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا ملک میں ہر طرف ہل چل مچی ہوئی تھی گناہ گار اور
بے گناہ معمولی سا شک ہونے پر بھی جیلوں میں بند کئے جا رہے تھے دیش
میں پولیس کا راج تھا پولیس جسے چاہے پکڑ لے اور جیل میں ڈال دے اُسے
کوئی پوچھنے والا نہ تھا پولیس والوں کو بھی اپنی پرانی دشمنی نکالنے کا اچھا موقع
مل گیا جو لوگ اُن کی نظروں میں کسی وجہ سے کھٹکتے تھے اُنہیں وہ چُن چُن کر
گرفتار کر رہے تھے

رشی کیش میں اُن دنوں ایک ایسے داروغہ جی تھے جو کہ اول درجہ کے
رشوت خور اور خود پسند افسر تھے وہ میرے بہت خلاف تھے دشمنی کی وجہ
ایک علیحدہ کہانی ہے جو پھر کبھی بیان کروں گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ داروغہ
صاحب اپنے خاص پٹھو سے جو پنجابی تھا اور بظاہر میرا دوست بھی تھا اکثر
یہ کہا کرتے تھے کہ رشی کیش سے دو آدمیوں کو ضرور نکال دوں گا۔ ایک تو مسٹر
شِو پرشاد گرگ سکریٹری نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی) اور دوسرے پنڈت خوشدل
کو۔ مسٹر شِو پرشاد میرا گہرا واقف کار تھا اور اب بھی ہے وہ ایک شریف اور
صاف گو اور فرض شناس انسان ہے اور صاف گوئی کی وجہ سے اُسے کافی
پریشانیاں اُٹھانی پڑیں اور کئی اُلجھنوں میں پھنسنا پڑا۔ لیکن آخر کار وہ سرخرو

ہو کر نکلا۔ اور دشمنوں نے منہ کی کھائی۔

اگست کے آخری ہفتہ کی ایک سُہانی شام کو میں اپنی دوکان سیوک فارمیسی واقعہ ریلوے روڈ رشی کیش پر بیٹھا تھا پنڈت مکند مالویہ جی (پسر مرحوم پنڈت مدن موہن جی مالویہ بنارس) کے ساتھ ملکی حالات پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا کہ اتنے میں دو تین پولیس والے ہاتھوں میں بندوقیں لئے میری دوکان پر چڑھ آئے۔ حیرت سے مالویہ جی نے میری طرف دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہے ہوں کہ یہ کیا معاملہ ہے مجھے خود علم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے اس لئے انھیں کیا جواب دیتا۔ میں ایک پولس کانسٹبل ہے جو مجھ سے ہمیشہ تپاک سے ملا کرتا تھا پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑا۔

"آپ کو داروغہ جی نے ابھی بلایا ہے؟ آخر وجہ کیا ہے؟ وہ بولا کہ رشی کیش میں دو جرمن جاسوس پکڑے گئے ہیں انھوں نے پولیس کو بتایا ہے کہ وہ لوگ اکثر آپ کے یہاں آیا کرتے ہیں اور آپ کے پکے دوست ہیں۔ جرمن جاسوس اور میرے پکے دوست میرا ماتھا ٹھنکا میں نے سوچا ضرور کوئی سازش میرے خلاف کھڑی کی گئی ہے لیکن جرمن جاسوس کا ساتھی ہونے کی وجہ سے قانون جو مجھے سزا دے سکتا ہے اس کے تصور سے میں کانپ اُٹھا۔ لڑائی کا زمانہ۔ اگست ۱۹۴۲ء کے دن اور پولیس والوں کی حکومت پھر داروغہ صاحب سے میری ان بن مجھے اپنا انجام سوچنے میں زیادہ دیر نہ لگی میں پنڈت مالویہ جی سے مخاطب ہوا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گا جس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اب آپ تشریف لے جائیں اگر میں جیل نہ بھیجدیا گیا تو دو تین روز بعد ہردوار آکر آپ سے ملوں گا۔ مالویہ جی نے فکرمندانہ لہجے میں کہا "میری مدد کی ضرورت ہو تو میں تھانے تک چلوں۔ شاید

ضمانت وغیرہ دینی پڑے"۔ میں نے کہا جس جرم میں یہ لوگ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں اُس میں ضمانت کیسے ہو گی آپ گھبرائیں نہیں اور میرے ساتھ جانے کا کشٹ نہ کریں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا"

پنڈت مالویہ جی سے رخصت لیکر میں پولیس والوں کے ساتھ چل پڑا۔ سامنے سے میرا پرانا گھریلو دولت رام آتا دکھائی دیا۔ اُس نے بلا کچھ مجھ سے پوچھے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اُسے ڈانٹا اور گھر جانے کی تاکید کی اُسے یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر میں رات کو گھر نہ پہنچوں تو کل صبح ہی لاہور جہاد تی تار دیدینا ایک میرے پتا جی کو اور دوسرا میرے عزیز دوست پنڈت شیام لال جی کے نام۔ اتنا کہنے کے بعد میں تیزی سے آگے بڑھ گیا لیکن دولت رام کے رونے کی آواز برابر میرے کانوں میں آرہی تھی راستے میں اُسی کانسٹبل نے پھر کہا "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں"؟ "کہو"۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ دونوں جرمنوں کو جانتے بھی ہیں تو بھی داروغہ کے سامنے اُن سے اس طرح ملنا جیسے آج سے پہلے آپ نے اُنھیں دیکھا تک نہیں۔ سمجھ گئے آپ"۔ میں اس کی ہمدردی پر خوش ضرور ہوا لیکن اس کی یہ تجویز مجھے پسند نہ آئی میں نے سوچا کہ اگر دراصل میرے وہ واقف کار نکلے تو اُن سے اس طرح آنکھیں نہ چرا سکوں گا اور پھر ایسا کرنے سے فائدہ بھی کیا ہو گا۔ اگر وہ واقعی جاسوس ہیں تو پولیس مجھے بھی ہرگز ہرگز نہ چھوڑے گی اور اگر وہ بے گناہ ہیں تب میرا اور اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی فیصلہ کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی میں نے نشچہ کر لیا کہ اگر وہ لوگ میرے واقف کار نکلے تو میں ان کا پورا پورا ساتھ دوں گا چاہے کتنی ہی مصیبت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

پولیس والے مجھے اُسی پنجابی صاحب کے گھر لیگئے جس کا ذکر میں نے

پہلے بھی کیا ہے۔ وہ پولیس والوں کے ساتھ ہمیشہ ملا رہتا تھا میری نظر میں
وہ ایک ایسا خطرناک آدمی تھا جو اپنے ذرا سے فائدے کی خاطر اپنے
دوستوں اور واقف کاروں کو مصیبت کے منہ میں دھکیل سکتا تھا جب میں وہاں
پہنچا تو دیکھا۔ دس بارہ پولیس والے مسلح اور وہاں کھڑے ہیں اور سامنے
کوٹھے پر میز کے گرد چار آدمی بیٹھے ہیں دو یورپین تیسرا پنجابی اور چوتھا پولیس
کا دیوان۔ میں کھٹا کھٹ سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھے پر پہنچا۔ دونوں یورپین میرے
استقبال کو اٹھ کھڑے ہوئے ان میں سے جو ذرا دبلا پتلا اور کمزور تھا اپنا ہاتھ
بڑھاتے ہوئے بولا۔ ہیلو پنڈت خوشدل" ہیلو مسٹر سمتھ میں نے ہاتھ ملاتے
ہوئے کہا۔ دوسرے لمحہ ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ ایک منٹ کے بعد
وہ اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا میٹ مائی فرینڈ پنڈت خوشدل)
"MEET MY FRIEND Pt. KHUSHDIL" یعنی میرے دوست پنڈت
خوشدل سے ملئے اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا ہی از مسٹر کومبلر اباؤٹ ہوم
آئی روٹ ٹو یو فروم لاہور)

"HE IS MR. KOMBLAR ABOUT WHOM I WROTE
TO YOU FROM LAHORE"

یعنی مسٹر کومبلر ہیں جن کی بابت میں نے لاہور سے آپکو ایک خط لکھا تھا۔
آگے بڑھکر مسٹر کومبلر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا "VERY GLAD TO SEE YOU"
یعنی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی (SO AM I). میری بھی یہی حالت ہے میں نے
جواب دیا۔ اس کے بعد بنا کچھ کہے سنے ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے میں نے اس خاموشی
کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر کومبلر کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ساڑھے چھ فٹ
کا ایک لمبا تڑنگا خوبصورت جوان تھا۔ چوڑی پیشانی۔ پرکشش آنکھیں ابھرا

ہوا سینہ مضبوط بازو۔ اور سب سے بڑھ کر دیدہ زیب تھی اس کی فریچ کٹ
داڑھی جس سے وہ بالکل جرمن جان پڑتا تھا میں اس کی بابت کچھ سوچ ہی رہا
تھا کہ نیچے سے ایک آواز سنائی دی۔ داروغہ جی تھانے میں پہنچ گئے ہیں اسلئے
ان سب کو وہاں لے چلو سب سے پہلے پولیس کا دیوان اُٹھ کھڑا ہوا اور اس
کے بعد ہم سب، اس پنجابی نے میری طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھا لیکن میں نے
نفرت سے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ میں تیز تیز قدم
رکھتا ہوا زینے کی طرف چلا گیا۔ میرے ساتھی فوراً ہی میرے پیچھے آ گئے
اور ہم بڑی سڑک پر تھانے کی طرف چلنے لگے آگے آگے پولیس کے آٹھ دس
سپاہی۔ درمیان میں مسٹر کومبلر مسٹر سمتھ اور میں ہمارے پیچھے چار
پانچ اور سپاہی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر میرے دونوں ساتھی واقعی جرمن
جاسوس ثابت ہو گئے تو پھر کیا ہوگا۔؟ ایک دم حوالات، جیل، عدالت
پھانسی کے نظارے میری آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے آ گئے۔
موت کا تصور کرتے ہی میرا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔ لیکن پھر دماغ نے
دل کو ڈھارس بندھائی۔ سوچنے لگا مرنا تو ایکدن ضرور ہے پھر مرنے سے
کیوں ڈرنا۔ برٹش سرکار کا باغی کہلانے میں مجھے رتی بھر ندامت محسوس
نہیں ہوئی۔ کیونکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ایک لمحہ کے لئے
بھی انگریزی حکومت کی وفاداری کے جذبات میرے دل میں کبھی پیدا نہیں
ہوئے تھے میری فطرت بچپن سے ہی انقلاب پسندانہ تھی اور میرے
دل میں انگریزی حاکموں کے لئے سخت نفرت تھی لیکن اُس دن افسوس
محض اس بات کا تھا کہ بنا کوئی خاص کارنامہ کیئے میری زندگی کا خاتمہ
ہونے کو ہے میں اگر کوئی ایسا کام کر سکا ہوتا جس سے میرے دیش کی

غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے میں کافی مدد ملتی تو مجھے اپنے مرنے کا ذرا بھی غم وافسوس نہ ہوتا۔ میں انہی خیالات میں غلطاں پیچاں تھا کہ مسٹر کومبلر نے مجھے کوہنی مارتے ہوئے کہا: "WHY ARE YOU SAD MY FRIEND?"

یعنی اُداس کیوں ہو میرے دوست۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں یکایک چونک پڑا کومبلر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا اتنے میں مسٹر سمتھ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا فکر نہ کرو پولیس کا میں بندوبست مسوری سے کر کے آیا ہوں اب یہ ہمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسٹر سمتھ سے میری پہلے بھی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اور وہ اردو ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی انگریزی جرمنی اور دیگر کئی زبانوں کو لکھ پڑھ سکتا تھا۔ کومبلر سے چونکہ میری پہلی ملاقات تھی اس لئے مجھے تب ہی یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی ہندوستانی جانتا ہے جب اُس نے دھیرے سے میرے کان میں کہا، رشی کیش کی پولیس فورس میں کُل کتنے آدمی ہیں؟ میں نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ پچیس[۲۵] چھبیس[۲۶] آدمی ہوں گے گھبراؤ نہیں اُن سب کے لئے میں اکیلا کافی ہوں"۔

"کیا تمہارے پاس ریوالور یا بم ہے۔" "نہیں کچھ نہیں" پھر کیسے اتنے آدمیوں کا مقابلہ کرو گے کومبلر نے مٹھی بند کرتے ہوئے مُکّا دکھا کر کہا "اس سے"۔ میں اس کی جرأت پر حیران رہ گیا اور کومبلر سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ پولیس تھانے کے بڑے پھاٹک پر مجھے داروغہ کی صورت دکھائی دی۔ میں خاموش ہو گیا اور ہم سب چپ چاپ تھانے میں داخل ہو گئے۔

وہاں پہلے ہی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں ہم سب بیٹھ گئے داروغہ جی نے بڑے رعب داب سے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہم سب کو بیٹھنے

کے لئے کہا اور ہمارے بیٹھتے ہی وہ سب سے پہلے مجھ سے گویا ہوئے۔
"ہاں تو خوشدل صاحب ان لوگوں کو آپ کب سے جانتے ہیں؟
"یہ آپ انہیں سے پوچھ لیجئے" میں نے جواب دیا۔ داروغہ جی کی
آنکھوں میں غصہ اُتر آیا۔ اُن کی بھویں تن گئیں اور کچھ کہنے ہی والے تھے
کہ یکایک مسٹر سمتھ بول پڑا۔
"آخر آپ کیا چاہتے ہیں اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟
سمتھ کا سوال سنتے ہی داروغہ جی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور چہرے پر مصنوعی
مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہنے لگے۔ صاحب مجھے D.F.O
نے اطلاع دی تھی کہ دو جرمن ریسٹ ہاؤس میں آکر ٹھہرے ہیں جن کے پاس
سوا سائیکلوں کے اور کوئی سامان نہیں شبہ ہوتا ہے کہ وہ دہرہ دون کے
قیدیوں کے کیمپ سے بھاگے ہوئے ہیں اسلیئے آپ ضروری کارروائی کریں۔
چنانچہ میں نے دیوان کو بازار میں بھیجا جہاں آپ لوگ چائے پی رہے
تھے اس کے دریافت کرنے پر آپ نے بتایا کہ آپ دونوں پنڈت خوشدل
کے دوست ہیں اور اُن سے ملنے آئے ہیں اسی لئے اُن کو بھی بلایا گیا ہے
"تو اب ہمیں کیا کرنا ہوگا" مسٹر سمتھ نے سوال کیا؟ آپ اپنا حسب نسب
اور رہنے کا مقام بتائیے نیز رشی کیش آنے کی وجہ بھی لکھائیے داروغہ جی
نے پنسل ہاتھ میں لیکر ایک خاکی کاغذ پر جھکتے ہوئے کہا۔
"آپ لوگ کون ہیں۔ برٹش، امریکن یا جرمن؟ کوئی بھی ہوں انگریز نہیں
ہیں بلکہ (FOREIGNER) یعنی ودیشی ہیں۔ رشی کیش میں کیسے آئے ہیں؟
پنڈت خوشدل سے ملنے" میں تو پہلے بھی پانچ چار بار اُن کے یہاں آچکا
ہوں۔ میرے دوست مسٹر کو میلہ رشی کیش دیکھنے کے خواہشمند تھے۔

اس لئے اُنہیں رشی کیش کی سیر کرانے اور پنڈت خوشدل سے ملوانے لا رہا ہوں"۔
"لیکن آپ اپنا بستر وغیرہ کیوں نہیں لائے ؟" "ایک دو دن کے لئے بستر کی کیا ضرورت ہے۔ پنڈت جی سے بستر اور دیگر سامان ہمیں مل سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں وہاں سے اتنا بوجھ اُٹھا کر لاتے"۔ "آپ مسوری میں کب سے رہ رہے ہیں؟"
"عرصہ ایک سال سے"۔ "وہاں کا کیا پتہ ہے؟" "نواب کے لینڈور بازار"۔ "وہاں اتنے عرصہ سے کیا کر رہے ہیں؟" "آپ کو یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق نہیں"۔ "آپ کے پاس پرمٹ یعنی رجسٹریشن کارڈ ہے؟" "وہ تو میں وہاں مسوری میں رکھ آیا ہوں۔ لیکن آتی دفعہ ایک روپیہ کے نوٹ پر ڈی۔ ایم۔ کے دستخط ضرور کرا لایا ہوں"۔ یہ کہہ کر مسٹر سمتھ نے جیب سے ایک روپیہ کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ "میرا فارم تو میرے پاس ہے"۔ مسٹر کومبلر نے جیب سے ایک فارم نکالا اور داروغہ جی کے سامنے رکھ دیا۔ داروغہ جی نے غور سے اس فارم کو دیکھا اور کہنے لگے۔

"آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے۔ اس کی معافی چاہتا ہوں D.F.O. اور میرا شبہ غلط نکلا۔ آپ آزاد ہیں جہاں جی چاہے جا سکتے ہیں"
"لیکن ہم رات کو تھانے ہی میں رہیں گے۔ اور یہیں کھانا کھائیں گے"۔ کومبلر نے ہنستے ہوئے کہا۔
"نہیں صاحب میرے پاس آپ لوگوں کو ٹھہرانے کا کوئی بندوبست نہیں"۔
"اگر ہم واقعی جرمن جاسوس ثابت ہو جاتے تب تو ہمارے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہی پڑتا"۔
"ہاں پھر دوسری بات تھی"۔ داروغہ جی نے شرمندگی سے کہا۔
"ہاں میرے لئے کیا حکم ہے داروغہ جی؟" میں نے پوچھا۔
داروغہ جی نے بناوٹی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "میں نے تمہارے لئے بہت کچھ سوچا تھا۔ لیکن ہو تم قسمت کے دھنی۔ اچھا پھر کبھی سہی۔ اب تو آپ جا سکتے ہیں"۔
ہم سب گھر واپس چلے آئے۔ اور اس طرح ایک بار پھر میں پولیس کے چنگل سے بچ نکلا۔

بڑے بول کا سر نیچا

دسمبر ۱۹۴۸ء میں مہنت سورگ آشرم سوامی شُندر پرکاش جی کے متواتر اصول پر بیئں نے سورگ آشرم کا چارج سنبھال لیا اور چند مہینوں میں ہی آشرم کی کایا پلٹ کر رکھدی۔ آشرم کے سُدھار کے سلسلے میں مجھے جن جن دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے اظہار کے لئے ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے یہاں صرف ایک واقعہ کا ہی ذکر کرنا ہے۔

میرے سورگ آشرم میں پہنچنے سے کئی سال پہلے سے ایک مقدمہ مہنت سورگ آشرم اور سیٹھ برلا میں چل رہا تھا۔ مقدمہ کی تفصیلات بہت لمبی ہیں مختصر الفاظ میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہوگا کہ دونوں پارٹیاں سورگ آشرم کے انتظام کے لئے ایک ٹرسٹ بنانا چاہتی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ سیٹھ جگل کشور برلا ایک پرائیویٹ ٹرسٹ بنانا چاہتے تھے جبکہ مہنت سندر پرکاش پبلک ٹرسٹ کے حق میں تھے میں نے مہنت جی کو ساتھ لیکر سیٹھ برلا اور گوسوامی گنیش دت جی سے اس سلسلہ میں بات چیت کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ برلا جی کے ایک دو کرمچاریوں نے انہیں گمراہ کر رکھا تھا۔ آخر کار اپنی قانونی پوزیشن کمزور دیکھکر برلا جی نے مہنت جی کی بات مان کر پبلک ٹرسٹ بنانا منظور کر لیا۔ اور اس طرح ایک کافی لمبے عرصے سے چلے ہوئے جھگڑے کا خاتمہ ہو گیا۔ جس پر دونوں طرف سے ہزاروں روپے خرچ ہو چکے تھے۔

میں اس بات کا کریڈٹ لے سکتا ہوں کہ میں نے سورگ آشرم کا پبلک ٹرسٹ بنانے میں کافی محنت کی اور اس میں کامیاب ہوا۔ یہ ایک بہت مشکل کام تھا۔ کیونکہ دونوں طرف کچھ ایسے غرض مند اور مطلبی لوگ تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ جھگڑا ختم ہو۔ کیونکہ ایسا ہونے سے اُن کے کھانے پینے کا سلسلہ بند ہوتا تھا۔ یہ امر حیران کُن تھا کہ مقدمہ کئی سالوں سے چل رہا تھا لیکن نہ تو برلا جی نے مہنت سورگ آشرم کو دیکھا اور نہ ہی گوسوامی جی نے مہنت سورگ آشرم سے ملاقات یا بات چیت کی تھی۔ میں نے پہلے تو گوسوامی جی اور مہنت جی میں ملاقات کروائی۔ پھر مہنت جی کو لیکر دہلی گیا اور وہاں برلا جی سے بات چیت ہوئی۔ گوسوامی جی بھی اس موقعہ پر موجود تھے اگرچہ دونوں صاحبان (برلا جی اور گوسوامی جی) مہنت سُندر پرکاش کی سادگی اور صاف دلی سے بہت متاثر ہوئے۔ لیکن اُنھوں نے ہائی کورٹ میں جو بیان دے رکھے تھے اُن کی روشنی میں وہ پبلک ٹرسٹ بنانے پر رضامند نہ ہوئے مہنت جی تو بالکل سیدھے سادے شخص تھے اُنہوں نے دونوں سجنوں کے سامنے ایک ہی بات کہی۔ "آپ پنڈت خوشدل سے بات چیت کریں مجھے اُن پر پورا بھروسہ ہے۔ جس کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے مجھے کہیں گے میں کروں گا"

گوسوامی جی نے برلا جی کی بات رکھنے کے لئے مجھ پر کافی زور دیا۔ اُنھوں نے بہت کہا کہ میں پرائیویٹ ٹرسٹ بنانے کے لئے مہنت جی کو رضامند کروں لیکن میں نہ مانا۔ اس سلسلے میں مجھے لالچ اور دھمکی بھی دی گئی لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور سورگ آشرم کا پبلک ٹرسٹ بنانے پر اڑا رہا۔ چنانچہ بات چیت ٹوٹ گئی میں مہنت جی کو ہردوار جانے والی گاڑی پر بٹھا کر آپ لاہور پہنچا اور وہاں پُوجیہ بھائی پرمانند جی سے ملا۔ انکیں صورت

* گوسوامی گنیش دت

حالات سمجھائی انہوں نے ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا گو سوامی جی کو جب یہ علم ہوا تو انھوں نے شری بھولا بھائی ڈیسائی سے (جو اُن دنوں آئی۔ این۔ اے کا نوارینچی مقدمہ لڑ رہے تھے اور برلا ہاؤس دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے) مقدمہ سورگ آشرم میں مشورہ کیا۔ ڈیسائی جی نے اُنھیں بتایا کہ اُن کا کیس کمزور ہے چنانچہ گو سوامی جی نے سورگ آشرم تار دیکر مجھے دہلی بُلایا میں اُن دنوں لاہور میں تھا۔ اور مقدمہ کے متعلق ضروری تیاری میں مصروف تھا مہنت جی نے اپنے بھولے پن کے باعث ایک ایسے شخص کو دہلی بھیجدیا جو روپے پیسے کے لالچ میں آکر ضمیر فروشی اور غداری کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتا تھا۔

چنانچہ اُس نے برلا پارٹی کو بتایا کہ پنڈت خوشدل کے آنے سے پہلے پہلے یہ معاملہ طے ہو جانا چاہیئے۔

اُس شخص نے مہنت جی کے وکیل کو بھی لالچ دیکر اپنی طرف کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مقررہ تاریخ پر میں نینی تال پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ ایک دن پہلے ہی عدالت میں راضی نامہ داخل کر دیا گیا ہے اور برلا پارٹی نے اپنی ہٹ چھوڑ کر پبلک ٹرسٹ بنانا منظور کر لیا ہے میں نے جب اپنے وکیل کو مہنت جی کا وہ خط دیا جس میں اُنھوں نے اپنے طرف کے ٹرسٹیوں کے نام لکھے تھے تو وہ وکیل صاحب جھنجھلا اُٹھے۔ مجھ پر بہت بگڑے اور وہ خط پھاڑ کر پھینکدیا۔ اُنہوں نے مہنت جی کی طرف سے تین چار ایسے اشخاص کے نام ٹرسٹیوں کے لئے دیئے تھے جو برلا پارٹی کے آدمی تھے خیر پبلک ٹرسٹ بن گیا اور مہنت جی کی جیت ہوئی لیکن وکیل صاحب کی بے ایمانی کے باعث چند ایسے اشخاص کے نام ٹرسٹیوں میں شامل نہ کئے جا سکے کہ جن کی موجودگی

سے آشرم کا کام بہت ترقی کر جاتا۔

نینی تال میں ہی کلکتہ کے ایک لکھ پتی مارواڑی سیٹھ کشن دیال جالان سے میری ملاقات ہوئی جو برلا جی کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے اور ٹرسٹ بننے پر اُس کے سکریٹری بنائے گئے تھے سورگ آشرم میں واپس آکر اُنھیں جب میرے کام کا علم ہوا۔ اور دو تین اشخاص نے اُن پر زور ڈالا کہ وہ مجھے آشرم کا مینیجر مقرر کر دیں تو وہ بولے۔ "ہم سکریٹری ہیں اس آشرم کے مالک ہیں اگر خوشدل نوکری کرنا چاہتا ہے تو ہمیں عرضی لکھ کر دے۔ میں نے عرض کی کہ نوکری نہ کرنے کی پرتگیا میں نے ۱۹۰۳ء میں کی تھی۔ اور آج تک اُسی پرتگیا پر قائم ہوں۔ مہنت جی سے دوستی کے باعث میں نے آشرم کا سُدھار کرنے کے لئے بطور مینیجر چند ماہ کے لئے کام کرنا منظور کیا تھا لیکن اب جبکہ آشرم کا پبلک ٹرسٹ بن چکا ہے اور مہنت جی کی پوزیشن اب ایک مینیجر کی سی ہو گئی ہے میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ ہاں اگر ٹرسٹ کو میری خدمات کی ضرورت ہو تو مجھے لکھے میں اُس پر غور کروں گا۔

سکریٹری صاحب میرا جواب سُنکر لال بھبھوکا ہو گئے بڑی اکڑ سے کہنے لگے "تمہیں تمہاری تو کیا کسی کی بھی مدد کی ضرورت نہیں ہم سارا انتظام خود کریں گے"۔ چنانچہ ماسٹر بنسی دھر (جو ٹرسٹ بننے سے پہلے لائبریرین تھا اور پندرہ روپے ماہوار الاؤنس لیتا تھا اور جسکو مہنت جی نے میری غیر موجودگی میں دہلی بھیجا تھا) کو آشرم کا سپروائزر مقرر کر دیا گیا۔ آخر مہنت جی سے غداری کرنے کا کچھ انعام تو ان کو ٹرسٹ کی طرف سے دیا جانا ضروری تھا ٹرسٹ بننے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی سکریٹری سیٹھ کشن دیال جالان اور مہنت سُندر پرکاش پر ایک غبن کا مقدمہ چلا۔ یہاں یہ امر بیان کر دینا

ضروری ہوگا کہ وہ مقدمہ مہنت جی کی درخواست پر قائم ہوا تھا اور جو رقم
(غالباً ایکہزار روپیہ) سکریٹری صاحب نے مہنت جی کو "بطور خرچہ" دی
تھی اُسے مہنت جی نے سرکاری خزانے میں جمع کردیا۔ اور اس گڑبڑ کی اطلاع
بھی کلکٹر صاحب کو دیدی جس پر مقدمہ غبن قائم ہوگیا۔ اور سیٹھ کشن دیال
جالان کے ساتھ مہنت جی کو بھی ملزم بنایا گیا اُس مقدمہ میں میری گواہی بہت اہمیت
رکھتی تھی کیونکہ یہی پر رقومات کا اندراج میرے سامنے ہوا تھا۔

وہی سیٹھ کشن دیال جالان جس نے کچھ عرصہ پہلے مجھ سے یہ کہا تھا کہ مجھے
تمہاری مدد کی کبھی ضرورت نہیں پڑ سکتی ایکدن میری فارمیسی (نیشنل آریوویدک
فارمیسی واقع میمی ہاؤس بھیم گوڈا روڈ ہردوار) میں آیا۔ اور اپنی پگڑی میرے
پاؤں میں رکھدی۔ کہنے لگا۔

"میں نے اُس دن جو آپکو اپمان جنک (توہین آمیز) شبد کہے تھے اُن
کی معافی مانگتا ہوں۔ اب میری عزت بچائیں اور مقدمے میں میرے حق میں
گواہی دیں۔ میں پانچ سو روپیہ ۵۰۰/- آپ کی بھینٹ کروں گا۔ میں نے جواب دیا
کہ میں آپ کے لئے تو کیا اپنے دوست مہنت شتدر پرکاش کے لئے بھی
عدالت میں جھوٹ نہ بولوں گا ہاں اگر آپ لوگوں نے اپنی چمڑی بچانے کیلئے مہنت
جی کو پھنسانے کی کوشش کی تو میں انہیں ہر ممکن طریقے سے بچانے کی کوشش کروں گا۔

سیٹھ صاحب بہت گڑگڑائے ہاتھ جوڑ کر بولے میری عزت اب آپکے ہاتھ میں ہے اگر
پبلک میں میری بے عزتی ہوگئی تو میں گنگا جی میں کود کر اپنی جان دیدوں گا یہ الفاظ کہتے ہوئے
اُنکی آنکھوں میں آنسو نکل آئے میں نے جالان سیٹھ کی یہ حالت دیکھی تو دل ہی دل میں بھگوان کو یاد کیا
اور یہ الفاظ خود بخود میری زبان سے نکل گئے "واقعی بڑے بول کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے"۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ گوسوامی جی اور سیٹھ برلا کی کوششوں سے سمجھوتہ ہوگیا اور سمجھوتہ کی شرط
کے مطابق سیٹھ کشن دیال جالان کو آشرم کے ٹرسٹ کی سکریٹری شپ سے علیحدہ کردیا گیا۔

(عنقریب چھپنے والی ہے)

ذاتی مشاہدات اور سچے واقعات پر مبنی

ایک اور دلچسپ اور سنسنی خیز کتاب

خدائی فوجدار

جس میں ہندوستان کے کئی نامور سادھو مہاتماؤں اور
کتھا واچکوں کے متعلق سو فیصدی سچے واقعات
درج کیے گئے ہیں۔ روحانیت کا اُپدیش کرنے والے
اپدیشکوں کے انسانیت سے گرے ہوئے کالے کارنامے
کو پڑھ کر یقیناً آپ چونک اُٹھیں گے۔

قیمت:- پانچ روپے Rs. 5/-

ملنے کا پتہ **پنڈت خوشدل** ۱۱ موتی بازار دہرہ

Published by :

PANDIT KHUSHDIL

11. Moti Bazar, Dehra Dun

Printed at :

MOHAMMADI PRESS DEOBAND

Title printed at :

FRONTIER MAIL PRESS

36, Ajmal Khan Road, Dehra Dun

Eddition 1st—500] 15th February, 1972 [Price Rs. 5/-

शतप्रतिशत सत्य घटनाओं पर आधारित

एक अद्भुत पुस्तक

"खुशदिल जीवन"

मूल्य प्रति कापी — पांच रुपये

मिलने का पता :

कार्यालय, "देश सेवक"

११ मोती बाज़ार; देहरादून

قیمت — فی — کاپی

Rs 5/- پانچ روپے

ملنے کا پتہ

دفتر دیش سیوک دہرہ دون